لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتا

حیاتِ مسعودی

یعنی

سوانح عمری حضرت سپہ سالار مسعود غازی شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نوشتہ

مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی بی اے ڈپٹی کلکٹر

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۵ء طبع ہوئی





27/x/34

فہرست مضامین

(حیاتِ مسعودی)

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحات

باب پنجم

باب ششم

انتساب

مخدومی و معظمی "معلی القاب" نواب صدر یار جنگ بہادر

مولانا مولوی حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے

علمی ترقی کے ذوق اور ملی بہبودی کے شوق کی یادگار

میں راقم الحروف اس چھوٹی سی کتاب کو موصوف کے

نام نامی سے منسوب کرنے کی جرأت کرتا ہے

بندہ

عباس شروانی

رائے بریلی
ستمبر ۱۹۳۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صلوا علیٰ رسولہ الکریم

حیاتِ مسعودی

مقدمہ

بنام شاہد نازک خیالاں
عزیز خاطر آشفتہ حالاں

سپہ سالار مسعود غازی عرف "بالے میاں" کون تھے، کہاں سے اور کیوں تشریف لائے، کہاں اور کیسے انتقال فرمایا، کوئی واقعی ہستی تھی یا محض فرضی، اُن کے حالات کیا ہیں؟ یہ چند سوالات ہم سے ہمارے ایک تعلیم یافتہ دوست نے فرمائے۔ اگرچہ ہم اُن کی ناواقفیت پر اُن کا مُنھ تکنے لگے مگر فوراً خیال آیا کہ اُن سے کیا۔ ایک زمانہ میں ہم خود ایسے ہی کورے تھے اور ہمارے بہت سے بھائی اسی حالت میں ہیں۔ علاوہ بریں یہ سوالات تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے حضرات کے لئے کچھ کم دل چسپ اور اہم نہیں ہیں، خاص کر جب کہ مسلم اور غیر مسلم حضرات مورخین اور غیر مورخین میں بعض صاحبوں کو سپہ سالار موصوف کی ہستی ہی میں شبہ ہے۔ اس خیال نے دماغ میں ایک برقی لہر دوڑادی اور ہم نے ارادہ کرلیا کہ خدا کی راہ میں سر دینے والے اس نوجوان غازی اور

ملّی محبت کے بادہ سے سرشار بہادر کے حالات کی تلاش کی جائے۔ اگرچہ راہ کٹھن ہے چھوٹا مُنھ اور بڑی بات ہے مگر ؎

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

اسی خیال نے ٹوٹا پھوٹا قلم اُٹھانے کی ہمت دلائی، ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ تاریخی گتھی دوست احباب سے چرچا ہوا تو دو ایک صاحب نے فرمایا کہ سپہ سالار مسعود غازی میں کون سی خاص بات ہے جو اس قدر کاوش کی جارہی ہے۔ ہم دل مسوس کر رہ گئے کہ اللہ رے مسلمانوں کا ادبار۔ ملّی ہیرو سے عدم واقفیت اور بے پروائی تو الگ۔ تاریخی گتھیوں کو سلجھانا جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کا قابل قدر شیوہ تھا آج کوہ کندن و کاہ برآوردن کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ بندہ نواز! شروع گیارہویں صدی عیسوی کا زمانہ۔ ذرائع آمد و رفت محدود۔ ریل، پختہ سڑک، موٹر، ہوائی جہاز، تار برقی، اخبار ندارد۔ غزنیں سے ہندوستان تک تین ماہ کا راستہ اور وہ بھی سخت سے سخت کٹھن۔ ہندوستانی غیر مذہب، غیر کفو والے۔ ملک کی تہذیب اور رسم و رواج۔ اور زبان جداگانہ۔ مذہبی جوش کا ہیجان اور تاریخی مصالحہ کا فقدان۔ سپہ سالار موصوف کی ہستی غلط فہمیوں کا شکار بلکہ بعض کو اس سے قطعی انکار اور پھر طرہ یہ کہ پرایوں کو چھوڑ اپنوں کے شک و شکوک۔ ۱۸ یا ۱۹ سال کی عمر اور غیر ملک میں تبلیغ اسلام۔ اُن کی موجودہ مخصوص تاریخ واقعات اور افسانوں کا مجموعہ۔ ان سب باتوں نے ہم کو اس سنگلاخ مگر دلچسپ زمین کی طرف کھینچا۔ مگر اس خیال نے سونے پر سہاگے کا کام دیا کہ انسانی عمر اور فرصت کا کیا اعتبار، چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اگرچہ تحقیقات نامکمل اور از حد نامکمل ہے مگر جو کچھ معلوم ہو ہدیۂ ناظرین کیجیے۔

ایک شخص آتا ہے اونچی نیچی زمین کو ہموار کر کے پہاڑ میں سرنگیں لگا کر اور خطرناک

دریاؤں پر پل باندھ کر۔ گھنے جنگل اور خار دار جھاڑی کو صاف کر کے ریل کی لائن ڈالتا ہی تو خدا کا دوسرا بندہ اُس پر ریل چلاتا ہی۔ ممکن ہی کہ آئندہ دیگر حضرات اس چٹیل میدان میں گل بوٹے کھلائیں اور اس مشکل مضمون پر مزید روشنی ڈال کر علم تاریخ میں اضافہ فرمائیں۔ اگر ہر ایک شخص ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے تو دنیا کی ترقی بند ہو جائے جمود اور سکون کا دور دورہ نظر آئے۔ ہاں ایک بات اور بھی قابلِ گزارش ہی۔ راقم الحروف کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ چند اوراق جو پیش کئے جاتے ہیں وہ سپہ سالار موصوف کی مکمل تاریخ ہی یا اس سے قبل کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اُن وقتوں کی وجہ سے جو اس مضمون پر غور کرنے کے بعد ناظرین کو بخوبی معلوم ہو جائیں گی اگر اس کتاب کو سپہ سالار موصوف کی مخصوص تاریخ مرآت مسعودی کی شرح سمجھ لیا جائے تو بھی ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اگر کوئی صاحب اس مضمون پر قلم اُٹھائیں تو نہ محض ہم بلکہ تاریخی دنیا اُن کی مرہونِ منت ہوگی۔ کیونکہ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہی۔ اہل نظر سے یہ بھی گزارش ہی کہ اگر ان خیالات اور حالات کے اظہار میں کوئی کمی پائیں تو ہم پر ظاہر کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

السعی منی والاتمام من اللہ

بڑی ہٹ دھرمی ہوگی اگر یہاں ہم اُن کرم فرماؤں کا تذکرہ نہ کریں جن سے ہم کو اس تاریخی کام میں مدد ملی۔

سب سے اوّل نام مخدومی معظمی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا ہی جن سے راقم الحروف کو اس کتاب کے متعلق نہایت مفید مشورہ اور قیمتی مدد حاصل ہوئی۔

کمیٹی انتظامیہ درگاہ سپہ سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ بہرائچ سب سے زیادہ شکریہ کی مستحق ہی۔ کمیٹی نے راقم الحروف کی گزارش پر کتب تاریخ کا بہت سا ذخیرہ حاصل کیا جن سے اس کتاب کی ترتیب میں بہت کچھ مدد ملی۔ مکرمی خواجہ ممتاز شاہ

صاحب رئیس بہرائچ سے وہ فوٹو مختلف عمارتوں کے حاصل ہوئے جو اس کتاب میں دیئے جاتے ہیں اور اس طریقہ پر خواجہ صاحب موصوف کی امداد گراں قدر ہے۔ مولوی محمد یعقوب بخش راغب صاحب بدایونی سے وقتاً فوقتاً مفید مشورے ملے۔ کتاب خانہ ریاست رام پور سے اور اُن کے عملہ سے بہت کچھ مدد حاصل ہوئی۔ گورنمنٹ ہند کی امپیریل لائبریری کلکتہ سے کتابوں کے اور کتبہ جات کے تراجم حاصل نہ ہوتے تو شاید اس کتاب میں اتنا بھی مواد نہ ہوتا جو اب ہے۔ محبی مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی ناظم مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے کتاب کی طباعت اور پروف کے متعلق جو امداد ملی وہ قابل شکریہ ہے ؎

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

رائے بریلی
ستمبر ۱۹۳۴ء

راقم آلِ عباس شروانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

سپہ سالار مسعود غازی کے بارے میں جن کو بعض لوگ کم عمری کی وجہ سے "بالے میاں" کے نام سے پکارتے ہیں یا جن کے نام کے ساتھ لفظ "شہید" بھی استعمال کیا جاتا ہے ہم نے جو سوالات اس کتاب کے مقدمہ کے شروع میں کئے ہیں وہ زمانہ وسطیٰ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے بڑے دلچسپ سوالات ہیں۔ اداتو وہ چند الفاظ میں کئے جا سکتے ہیں مگر جوابات کے لئے صفحے کے صفحے چاہئیں اور پھر بھی آسان نہیں۔ نو سو برس زمانہ کی دوری اور تاریخی مصالحہ کی کمی نے اُن کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ پھر طرّہ یہ کہ غلط سلط روایتوں نے ایسی پیچیدگی ڈال دی ہے کہ اس گتھی کو سلجھانا آسان نہیں ہے۔ بے سروپا بازاری قصوں کو چھوڑ کر تاریخی اعتبار سے سچّے حالات پر جہاں تک ہم کو معلوم ہے کسی صاحب نے قلم نہیں اُٹھایا اور جو حالات تاریخوں میں موجود ہیں اُن کی تنقید ہماری نگاہ سے نہیں گزری۔ یہ سچ ہے کہ اردو زبان میں چند چھوٹے چھوٹے رسالے اس مضمون پر بازاروں میں ملتے ہیں مگر وہ فسانۂ عجائب اور نیرنگ خیال کے رنگ میں رنگے ہوئے اور تاریخی حیثیت سے پایۂ اعتبار سے بالکل گرے ہوئے ہیں۔ تاریخ اور ہمارا مشاہدہ دونوں ہم کو بتاتے ہیں کہ ایسی بڑی ہستیاں چند ہی گزری ہوں گی جن کو اگر کچھ نے اچھا کہا تو دوسروں نے بُرا نہ کہا ہو۔ یہاں تک کہ ایسے حضرات اور اُن سے

مقدس تر ہستیوں کا تو کیا کہنا۔ خدا تعالیٰ کی ہستی کو بھی اگر بعض نے مانا تو دوسروں نے اُس سے قطعی انکار کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی طبیعت کا خاصہؔ یہی ہے اور یہی خاصہؔ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ ذی روح ہستیوں اور بے جان چیزوں کے بعض لوگ موافق ہوتے ہیں تو دوسرے مخالف ہمارے ہیرو سپہ سالار موصوف بھی انھیں چند افراد میں سے ہیں اور اسی وجہ سے شکوک اور اعتراضات کا شکار ہوئے۔ ہم تو کیا کوئی بھی بجز خدا رسیدہ لوگوں کے اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ انسانی فطرت کو کھو دے۔ ہاں اُس پر غالب آجانا نفس کُش اور اللہ والوں کے لئے ممکن ہے، اگرچہ اُن کا سمجھنا ہر شخص کے لئے محال۔

اسی سمجھ کے پھیر نے بعض لوگوں کو ایسے بڑے حضرات کی مافوق العادت باتوں کے سمجھنے سے قاصر رکھا۔ مگر اُن کے سمجھنے کی کوشش ہر انسان کا فرض ہے۔ یہ چند صفحات جو ہم ڈرتے ڈرتے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

ایمانداری کے ساتھ اختلاف رائے کی کوئی شکایت نہیں اور نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس اختلاف سے تبادلۂ خیالات میں مدد ملتی ہے۔ برائی دُور ہوتی ہے اور بھلائی پھیلتی ہے مگر کسی مخصوص دنیاوی مقصد کے حصول کی غرض سے یا مذہبی تعصب کے سبب سے جاہل لوگوں کے سامنے غلط بیانی کرنا یا بظاہر منطقی دلائل کی آڑ میں اور سوفسطائی طریقہ سے غلط نکتہ چینی کرنا، ایمانداری کے خلاف ہے اور ایک ایسا اخلاقی جرم ہے جس کا ارتکاب سپہ سالار مسعود غازی کے بارے میں بہت کچھ کیا گیا ہے۔ ہم کس کس کا نام لیں۔ بیگانوں سے شکایت نہیں۔ اپنے بھی اس ذاتِ مقدس کی بابت عدم واقفیت کی وجہ سے طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے ہیں اور انھیں چہ میگوئیوں کا استیصال ان چند صفحات میں ہمارے مدّنظر ہے، مگر کھرے کھوٹے کی پرکھ کے ساتھ نہ کہ یک طرفہ۔

پیشتر مورخ کا اصلی کام صرف اس قدر سمجھا جاتا تھا کہ وہ تاریخ کے خشک واقعات کو ایک خشک طریقہ سے پبلک کے سامنے پیش کردے اور بس۔ کسی قسم کی رائے زنی یا نتائج

نکالنا اُن کے فرائض سے باہر تھا۔ مگر اب زمانۂ حال کا بجا طور پر یہ رنگ ہے کہ ان خشک واقعات سے نتائج نکالے جائیں جو پڑھنے والوں کے لئے سبق آموز ہوں۔ کھرے کھوٹے کی جانچ کی جائے۔ بے جا تعریف سے پرہیز کیا جائے اور سچی بات کو چھپایا نہ جائے خواہ وہ کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔ ورنہ تاریخ کا اصلی مقصد اور فائدہ فوت ہو جاتا ہے۔ ان چند صفحات میں یہی اصول اور معیار ہم اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ یہ معیار مشکل ہے مگر ہمتِ مرداں مددِ خدا پر ہم کو کامل بھروسا ہے۔

کسی تاریخی واقعہ یا کسی بڑی ہستی کے حالات معلوم کرنے اور اُن سے صحیح نتیجے نکالنے کے لئے از بس ضروری ہے کہ اُن کے ماحول، فضا اور زمانۂ متعلقہ کی عام حالات پر نظر ڈالی جائے۔ اگرچہ ان باتوں کا براہ راست اُس ہستی اور تاریخی واقعہ سے کوئی تعلق نہ ہو ورنہ ممکن ہے کہ اُس ہستی یا واقعہ کے سمجھنے میں غلطی پیدا ہو۔ تصویر کا صرف ایک رُخ نظر آئے اور دوسرا پہلو انسان کی کوتاہ نظری کی وجہ سے کورا بچ جائے۔

مختلف قوموں، مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں کے معیار، نقطۂ خیال اور باتوں کے جانچنے کے طور طریقے جداگانہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جس بات کو ہم اچھا سمجھیں دوسرے اُس کو برا جانیں۔ افریقی حبشیوں کے نزدیک سیاہ رنگ، موٹے ہونٹ، پستہ قد خوبصورتی میں داخل ہیں اور ہم ان باتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی طریقہ سے یہ حبشی ہم پر ہنستے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے لئے ایک معیار مقرر کرنا سراسر غلطی ہوگا اور اس لئے ہر پہلو پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس اصول کے ماتحت سب سے اول ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ سپہ سالار مسعود غازی کا کون زمانہ تھا اور اُس زمانہ کا رنگ ڈھنگ کیا تھا۔ ورنہ آج کل کے اصول کے مطابق اُس زمانہ کی باتوں کے دیکھنے میں بڑی غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل تو آگے آئے گی یہاں صرف اس قدر گزارش ضروری ہے کہ تاریخ کی رو سے سپہ سالار مسعود غازی محمود غزنوی فاتح ہند کے زمانہ میں یعنی گیارہویں

صدی عیسوی کے پہلے ربع میں پیدا ہوئے اور محمود غزنوی کے انتقال کے بعد تین چار سال تک زندہ رہے۔ اب اس زمانہ کا خاکہ پیش نظر رکھنا ہے۔

اس زمانہ میں ایشیا پرانی تہذیب اور شائستگی کا گہوارہ تھا۔ یورپ اُس کی صحبت سے مالا مال ہو کر دنیاوی ترقی کی دوڑ میں آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں کہیں مذہبی تبلیغ کا زور اور پولیٹیکل تبدیلیوں کا شور تھا۔ ہندوستان میں حکمرانی کا شوق آپس میں روز نت نئے تماشے دکھاتا تھا۔ مگر باہر والوں کے مقابلہ میں سب ایک تھے۔ بُدھ مت کو دبا کر برہمنوں کے مذہب نے نئی زندگی پائی تھی۔ اس احیا نے غیر مذہبوں کے خلاف ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور اس نئی روح کی وجہ سے باہر والوں نے بھی خوب خوب ہاتھ دکھائے۔ ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ تھا مگر شمال اور مغرب کے سمت میں اُس کے حدود آج سے زیادہ وسیع تھے۔ اس زمانہ میں یہاں یہ تماشا ہو رہا تھا کہ آج ایک راج بگڑا تو کل دوسرا بنا۔ آج ایک قوم اور ذات کے راجہ کا زور ہے تو کل دوسرے نے سر اُٹھایا۔ ہندو دھرم کی ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے سردار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دولت اور مال کی ہوس نے لوگوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی کے مصنف کلہانا پنڈت کے قول کے مطابق ہندو راجہ ہرش نے مال کی ہوس میں یہ ادھرمی دکھائی کہ مندروں کو لوٹا اور مورتوں کو رسیوں سے کھنچوایا (راج ترنگنی ترجمہ انگریزی دت صفحہ ۲۵۱ جلد اول) ہندوستان کی یہ دھن دولت اور آپس کی لڑائی دیکھکر باہر والوں کو بھی اُس پر چڑھائی کے حوصلے ہوئے اور کچھ غیر مذہب والوں کو خیال پیدا ہوا کہ آؤ اس بڑے ملک میں اپنے دھرم کا پرچار کریں۔ حاشا وکلاّ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کشمیر کے راجہ ہرش نے یہ ستم ظریفی دکھائی تو دوسروں کے لئے بھی ایسا ہی کرنا جائز تھا۔ ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُس وقت کچھ عجب حالت تھی۔ ایک طرف مذہب کا زور شور تو دوسری طرف ملک اور مال کی

ہوس میں مذہب کی توہین۔ آج کل کی طرح سے لوگوں کا مطمح نظر اُس وقت یہ نہ تھا کہ

فی الحقیقت نسبِ عاشق و معشوق یکیست ✿ بوالفضولاں صنم و برہمنے ساختہ اند
یک چراغ ست دریں خانۂ و از پرتوِ آں ✿ ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند
(فیضی)

ہندوستان ہی سے کیا ہی باہر کا حال سُنیئے۔ عیسائی قومیں چاہتی تھیں کہ ہر شخص عیسائی ہو جائے اور مسلمان چاہتے تھے کہ ہر شخص رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا بنے۔ ہسپانیہ میں مسلمان اور عیسائیوں میں آویزش شروع ہوئی یہاں تک کہ وہاں اسلام ٹھنڈا ہو گیا۔

خود مسلمانوں میں بنو فاطمہ اور بنو عباس میں چھیڑ چھاڑ رہی۔ بغداد میں بنو عباس کا چراغ سلجوقی ترکوں اور مغلوں کی آندھی سے ٹمٹمانے لگا۔ محمود نے نصف ایشیا میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ بھلا ان سب اثرات سے محمودی زمانہ کے لوگ کب بچ سکتے تھے اور ہندوستان کی اندرونی حالت اس بادشاہ اور اُس کے آوردوں کے لئے مقناطیسی کشش کا کام کئے ہوئے بغیر کب رہ سکتی تھی۔ محمودی حملوں کا منشا اور اُن کی علت غائی ہمارے مضمون کے حدود سے باہر ہے۔ البتہ صرف اس قدر عرض ہے کہ اس عظیم الشان بادشاہ کی تبلیغی کوششوں نے اور دنیاوی طاقت اور ترقیوں نے دوسروں پر رنگ جمایا۔ وسط ایشیا اور موجودہ افغانستان، عراق اور ایشیائے کوچک کے رہنے والوں کے لئے ہندوستان کی راہیں کھل گئیں اور پھر وہ اچھی طرح اس سبق کو دہرانے لگے کہ مذہبی تعلیم احکام اور اُن کے شرائط کے ماتحت ہر مسلمان مبلّغ ہے۔ اس تبلیغی جوش کو بڑھانے اور اس کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اگر کوئی اور خارجی اسباب پیدا ہو گئے تو انھوں نے سمندِ ناز کے لئے تازیانہ کا کام کیا۔ محمود کے بعد بھی اُس کے بیٹے، پوتے، پرپوتے، اہالی موالی اسی رنگ میں رنگے اور تبلیغی دُھن میں لگے رہے۔ غزنوی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ مگر ہندوستانی غزوات کا شوق غزنیوں کے دل سے نہ گیا۔ اگر اب آپ دفینہ

میں رکھیں کہ سپہ سالار مسعود غازی انھیں حالات میں پیدا ہوئے اور انھیں میں پلے تو آپ اُن کی ہستی کو بہتر سمجھ سکیں گے۔ اگر سچ پوچھئے تو مذہبی تبلیغ آج بھی جاری ہے۔ شدھی اور تبلیغ کے ڈرامے آج بھی دکھائے جا رہے ہیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان عیسائی یا یہودی۔ الغرض یہی ماحول اور یہی فضا تھی جنھوں نے سپہ سالار مسعود غازی کو بھی متاثر کیا اور اُس اثر نے ہندوستان میں اپنے جلوے دکھائے۔ سپہ سالار مسعود نے جو کچھ کیا وہ اُس زمانہ کا تقاضا تھا اور دیگر اسباب کے ساتھ مل کر تبلیغی شوق اُن کو غزنین سے ہندوستان لایا۔ جیسا کہ ہم آئندہ تفصیل کے ساتھ عرض کریں گے۔ سپہ سالار موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے اور اُن کی بابت رائے قائم کرتے وقت ہم کو ان اثرات کا لحاظ رکھنا پڑے گا ورنہ اُن کی ہستی اور حرکات سکنات کے سمجھنے میں غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جب اس قسم کے اثرات در پردہ اپنے کام میں لگے ہوں تو کسی کی بابت یہ کہدینا کہ وہ اوروں کے مقابلہ میں متعصب ہے یا ملک گیری کی ہوس دامن گیر ہے یا اُس کے افعال و اقوال ناموزوں تھے بڑی ہٹ دھرمی کی بات ہوگی۔ جو باتیں پیشتر لوگوں کی عقلوں کو چکر میں ڈال دیتی تھیں آج اُن کو سائنس کے کرشموں نے آئے دن کا کھیل بنا دیا ہے۔ جو باتیں پیشتر پردۂ راز میں تھیں آج تاریخی تحقیقات نے اُن پر اس قدر تیز روشنی ڈال دی ہے کہ وہ دن کی طرح آشکارا ہیں۔ اُس زمانہ کے نقطۂ خیال اور آج کل کے نقطۂ خیال میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہم کو اُمید ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے متعلق جو کچھ عرض کیا جائے اُس پر غور کرنے میں ناظرین مندرجۂ بالا اصول سے کام لیں گے۔

اب ہم اس اجمال کی تفصیل عرض کرنے سے قبل ماخذ حالات کے متعلق کچھ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ ناظرین ان چند سطور کو مجنوں کی بڑ اور محض لاابالی خیال نہ کریں۔

باب اوّل

مآخذ حالات
Bibliography

آج کل کی تعلیمی ترقی اور دماغی ارتقا کا یہ نتیجہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ ہر رطب و یابس کو بغیر کسی سند کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور قدم قدم پر ہر بات کا ثبوت طلب کرتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً یہاں یہ سوال ہوگا کہ مقامی روایات اور بازاری قصّوں کو چھوڑ کر جنھوں نے افسانوں کی صورت اختیار کر لی ہے سپہ سالار مسعود غازی کے صحیح حالات کے معلوم کرنے کا اور اُن پر سے تاریکی کا پردہ اُٹھانے کا ذریعہ کیا ہے۔ اُن کے بارے میں ہم کو مصالحہ کہاں سے ملا اور کیا ملا جب تک کہ اُس کو ناظرین کے سامنے پیش کیا نہ جائے اور اُن کی باریک بین نگاہ اُس کی بُرائی بھلائی کو خود نہ جانچ لے اُن کا اطمینان مشکل ہے ورنہ یہ اوراق محض ہماری رائے زنی سمجھی جائے گی۔ ہم کو افسوس ہے کہ چند وجوہ سے جن کا اظہار یہاں ضروری نہیں ہے ہماری تحقیقات مکمل نہ ہو سکی۔ جو کچھ معلوم ہو سکا بوجوہ اُس کا اظہار مناسب سمجھا گیا۔ دنیا ایک جگہ قائم نہیں ہے انکشافات کا سلسلہ جاری ہے اب نہیں تو آئندہ وہ تاریخی گتھیاں سلجھ جائیں گی جن کو ہمارے کمزور ناخن نہ کھول سکے۔ راقم الحروف کی تحقیقات کا نتیجہ آسانی سے چار حصّوں میں تقسیم ہو سکتا ہے یعنی (۱) عام کتب تواریخ و سیر (۲) سپہ سالار مسعود غازی کی مخصوص تاریخ یعنی مراۃ مسعودی (۳) کتبہ جات سنگیں و مسی (۴) مقامی روایات۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم سلسلہ وار لیتے ہیں۔

(۱) عام کتب تواریخ وسیر کتب تواریخ اور سیر سے صحیح نتیجے نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب سے اوّل سپہ سالار موصوف کے ہی زمانہ کی کتابوں اور عبارتوں کا کھوج لگائیں۔ اُن کے بعد عین مابعد کے زمانے کے کتابوں کی ورق گردانی کریں۔ بعدہٗ درمیانی زمانہ کی اور سب سے آخر میں زمانۂ حال کی تصنیفوں پر نگاہ ڈالیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بحرِ ذخارہے مگر اُس سے پار لگنے کے لئے حتی المقدور ہاتھ پیر چلائیں گے۔ تاریخی اصول اور بہت اچھا اصول یہ ہے کہ کسی مخصوص واقعہ کے متعلق اگر اُسی زمانہ کے تحریری حالات مل جائیں تو وہ اعتبار کے لحاظ سے اٹل سمجھے جاتے ہیں اور بعد کی تحریرات زمانہ کے لحاظ سے جس قدر دُور ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر پایۂ اعتبار سے گرتی جاتی ہیں۔ اگرچہ ضروری نہیں ہے کہ اس قاعدۂ کلیہ کے مستثنیات نہ ہوں مثلاً بعض تاریخی انکشافات آج کل ہو رہے ہیں تو اُن کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے مگر انکشاف کا ہونا دوسری بات ہے اور زمانہ متعلقہ کی تحریر کا آج ملنا دوسری شے ہے۔ اس اصول کے ماتحت پہلا سوال یہ ہوگا کہ سب سے اول سپہ سالار مسعود غازی کے زمانہ کا تعین کر لیا جائے تاکہ ہم آگے بڑھ سکیں جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ آگے چل کر بتا سکیں گے، اُن کا زمانہ ۴۰۵ھ مطابق ۱۰۱۴-۱۵ء سے لے کر ۴۲۴ھ مطابق ۱۰۳۳-۳۴ء تک ہے۔ اس زمانہ کی کتب تواریخ اور سیر جو اُس کے ظالم ہاتھوں سے بچ کر باقی رہ گئی ہیں بہت ہی کم ہیں۔

تاریخ یمینی للعتبی ان میں سب سے اول محمودی دربار کے مورخ ابونصر محمد بن عبدالجبار العتبی کی تاریخ یمینی ہے مگر بدقسمتی سے اس میں صرف ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء تک کے حالات پائے جاتے ہیں یعنی دوسرے الفاظ میں اس مختصر اور نامکمل مگر ہمعصر تاریخ کا سلسلہ اُس وقت بند ہو گیا جب کہ سپہ سالار موصوف کی عمر ۶ یا ۷ سال کی تھی۔ اس لحاظ سے کوئی تعجب نہیں ہے کہ اس میں

براہ راست سپہ سالار موصوف کا کوئی تذکرہ ہم کو نہیں ملا۔ مگر باوجود اس کمی کے ہمارے
مضمون کی بعض ضمنی باتوں پر اس تاریخ نے روشنی ڈالی۔ اس تاریخ کے فارسی ترجمہ
جرباذقانی کا ایک نسخہ رام پور کے مشہور کتاب خانہ میں ہم کو ملا۔ اس کے علاوہ انگریزی
ترجمہ جیمس رینالڈس نے ۱۸۸۸ء میں شائع کیا اور اس کے اقتباسات کے ترجمے جو
سرہنری ایلیٹ نے کئے مؤلف ڈاؤسن نے تاریخ ہند کی جلد دوم میں دیئے ہیں۔

اصل کتاب کم یاب ہے۔

زین الاخبار گردیزی

اس تاریخ کے بعد ابوسعید عبدالحی گردیزی کی کتاب
زین الاخبار کا نمبر آتا ہے جو ۴۴۰ھ میں یعنی محمود کے
انتقال کے نو دس برس بعد شائع ہوئی۔ اس کو بڑی محنت کے بعد حال میں ڈاکٹر
ناظم صدیقی علیگ نے گوشۂ گمنامی سے نکال کر اور برلن (جرمنی) میں طبع کرا کر تاریخی دنیا
پر احسان کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر موصوف کے اس کتاب سے صرف تاریخ فرشتہ
اور طبقات اکبری کے مصنفوں نے کام لیا۔ جو حالت العتبی کی ہے وہی اس تاریخ کی ہے
اس کتاب میں اُن حملوں کا ذکر ہے جو محمود نے ہندوستان پر کئے۔ اس میں بھی ہم کو
سپہ سالار موصوف کا نام نہیں ملا۔ مگر مضمون کے بعض حصوں پر ضمناً روشنی پڑی جیسا کہ
ہم آئندہ دکھائیں گے۔

ابوالفضل بیہقی

اس کے بعد ابوالفضل محمد بن حسین البیہقی کی تاریخ کا نمبر ہے جو
۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں یعنی زین الاخبار کے کچھ ہی سال بعد شائع ہوئی۔
مورخ مذکور محمود غزنوی کے دفتر میں ملازم تھا اور بعدہٗ محمود کے بیٹے مسعود کے
زمانہ میں اس کا عروج تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ میں ہم کو سپہ سالار موصوف کے
حالات ملتے تو وہ نہایت مستند ہوتے مگر ہم کو یہاں بھی ایک گونہ نا اُمیدی سے
سابقہ پڑا۔ لیکن اس میں بھی براہ راست سپہ سالار کا تذکرہ نہ ملنا اچنبھے کی بات

نہیں ہے کیوں کہ محمود غزنوی کے متعلق تاریخ کا جو حصّہ تھا وہ دنیا سے اٹھ گیا اور اس کی بارہ ۱۲ جلدوں میں سے اور بقول دیگر تیس ۳۰ جلدوں سے صرف چار پانچ جلدیں رہ گئی ہیں جن کا تعلق محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کی حکومت سے ہے۔ خدا بھلا کرے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کا کہ اُس نے باقی ماندہ اجزا کو چھاپ کر تاریخی دنیا کو مرہونِ منت بنایا۔ اس نسخہ میں بھی عبارت دو ایک جگہ سے حذف ہے جو حصّہ باقی رہ گیا ہے اُس میں تاریخ مسعودی کا آغاز ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء یعنی مسعود غزنوی کی تخت نشینی سے ہوتا ہے۔ یہی زمانہ سپہ سالار موصوف کے کارناموں کا تھا لیکن اوّل تو مصنف خود اس زمانہ میں ہندوستان میں نہیں آیا۔ دوسرے سپہ سالار موصوف مسعود غزنوی سے الگ تھلگ رہے جیسا کہ ہم آئندہ دکھائیں گے اور وہ محمود کے زمانہ میں ہی ہندوستان آچکے تھے۔ اس لئے اس تاریخ میں براہ راست سپہ سالار موصوف کا تذکرہ نہ ملنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُن کے وجود اور ہستی سے انکار کر دیا جائے۔ مگر ضمنی طور پر بہ نسبت العتبی اور گردیزی کے ہم کو اس مورّخ سے اپنے مضمون کے بارے میں زیادہ مدد ملی۔

ابوریحان البیرونی

اسی زمانہ میں محمود کے انتقال کے عین مابعد یعنی ۱۰۳۱ء میں ابوریحان البیرونی نے ہندوستان میں کئی سال رہ کر اور سنسکرت زبان سے پوری واقفیت حاصل کر کے اور یہاں کی ریت رسم دیکھ کر اپنی مشہور کتاب تحقیق ماللہند شائع کی جس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا اور انگریزی میں جس کو ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ نے پیش کیا۔ بعض لوگ اس کو غلطی سے تاریخ الہند کے نام سے پکارتے ہیں۔ دراصل یہ کوئی تاریخ نہیں ہے بلکہ ہندوستانی رسم ورواج اور علوم کے جو اُس زمانہ میں جاری تھے حالات ہیں اور اس میں بعض جغرافیائی معلومات بھی درج ہیں اِن سے ہم نے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اگر یہ راست گو، منصف مزاج اور اُس وقت کی ہندوستانی زبان سمجھنے والا مصنف یہاں کے تاریخی حالات قلمبند کرتا تو آج ہم کو تاریخی معائب کی

کمی پر آٹھ آٹھ آنسو نہ رونا پڑتا۔

دیگر کتب ہم عصر | ہم عصر تاریخ کی یہ کتابیں تو وہ ہیں جن کو ہم دیکھ سکے مگر کچھ ایسی تاریخیں بھی ہیں جو یا تو اب دنیا سے مفقود ہیں یا ہم کو نہ مل سکیں

یہاں اُن کے نام درج کر دینا اس واسطے ضروری ہے کہ ممکن ہے کہ بعض دیگر حضرات کو دستیاب ہو جائیں یا اُن کی نظر سے گزر چکی ہوں اور وہ حضرات اُن کے ذریعے سے اس مضمون پر مزید روشنی ڈال سکیں۔ ان میں حسب ذیل کتب شامل ہیں: محمود غزنوی کی سرکاری یادداشت یا واقعات جس کا نام دولت نامہ ہے۔ تاج الفتوح جس کی بابت مورخین میں اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ بیہقی کے بعض مجلدات کا نام ہے مگر ڈاکٹر ناظم صدیقی کا خیال ہے کہ یہ محمودی دربار کے مشہور شاعر عنصری کی ایک نظم کا نام ہے جس میں محمودی فتوح کا ذکر ہے۔ عبدالملک بن محمد بن اسمٰعیل الثعلبی کی تصنیف کتاب "فی غزر اخبار ملوک الفرس"۔ محمودی دربار کے دبیر یا سکریٹری ابو نصر مشکان کی کتاب "مقامات ابو نصر مشکانی"۔ زینت الکتاب تاریخ محمود وراق جو بقول بیہقی (صفحہ ۳۱۷ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء میں تصنیف ہوئی اور جس میں ۴۰۹ھ / ۱۰۱۸ء تک سے حالات ہیں۔ تجارب الامم مصنفہ ہلال بن محسن بن ابراہیم الصابی۔ فرید التواریخ مصنفہ ابو الحسن محمد بن سلیمان۔
ان کتابوں کے حوالے ڈاکٹر ناظم صدیقی نے اپنی انگریزی تاریخ محمودی کے صفحہ ۲ و ۳ پر دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخ ملا محمد غزنوی ہمارے نقطہ خیال سے بہت اہم تاریخ ہے جو اب نہیں ملتی۔ سپہ سالار مسعود غازی کی مخصوص تاریخ مرأت مسعودی بقول مصنف کے اسی کا خلاصہ ہے۔ مرأت مسعودی کے مصنف کا قول ہے کہ ملا محمد غزنوی محمود کے زمانہ میں آئے۔ اگر آج یہ تاریخی اور علمی جواہر ریزے موجود ہوتے تو ہماری معلومات میں کس قدر اضافہ ہوتا۔

محمود غزنوی کے عین مابعد کا زمانہ | اب محمود غزنوی کے عین مابعد کا زمانہ آتا ہے

یہ زمانہ بھی مسلمان مورخین کا مرہون منت ہی کہ اُنھوں نے سلسلہ کو تھوڑا بہت جاری رکھا اس درجہ کی کتب میں چند کتب ہیں اور اگرچہ ہم پر ناظرین ہنسیں گے کہ تذکرہ ہی سپہ سالار مسعود غازی کے حالات کے ماخذ کا، مگر ذکر کیا جارہا ہی اُن کتب کا جو ہماری نگاہ سے نہیں گزریں۔ مگر مندرجۂ بالا وجوہ سے ہم ان کا نام درج کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں حسب ذیل کتب شامل ہیں: سیاست نامہ مصنفہ ابو علی حسن بن علی نظام الملک وزیر سلطان ملک شاہ سلجوقی (۴۸۴ھ مطابق ۱۰۹۱ء) مجمل التواریخ جس کے مصنف کا اب تک پتا نہیں چلا اور جو بقول سر ہنری ایلیٹ کے عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی (ایلیٹ ڈاؤسن جلد اول صفحہ ۱۰۰) یہ سندھ کی تاریخ بتائی جاتی ہی جس کا ترجمہ عربی میں سنسکرت سے ہوا تھا۔ المنتظم فی تواریخ الملوک والامم مصنفہ ابو الفرج عبدالرحمٰن جوزی۔ اخبار الدول مصنفہ جمال الدین حلبی۔ جامع الحکایات ولُب الالباب مصنفہ نور الدین عوفی۔

اس زمانہ کے کچھ بعد کی تاریخیں جو ہماری نظر سے گزریں یہ ہیں:

عین مابعد زمانہ کے بعد کی تاریخیں

راج ترنگنی تاریخ کشمیر مصنفہ کلھانا پنڈت جس کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہی۔ یہ ۵۴۵ھ مطابق ۱۱۵۰ء میں تصنیف ہوئی۔ تاریخ تو یہ کشمیر کی ہی مگر اس سے ہمارے مضمون زیر بحث کے دو ایک واقعات پر روشنی پڑتی ہی۔

ساتویں صدی ہجری میں دو تاریخیں تصنیف ہوئیں جن میں ہندوستان کے چیدہ چیدہ حالات ہیں۔ یعنی الکامل فی التاریخ۔ جو تاریخ کامل کے نام سے مشہور ہی اور جس کو ۶۲۹ھ میں ابن الحسن علی المعروف بہ ابن الاثیر نے تصنیف کیا۔ اپنے مضمون میں دو ایک جگہ ہم نے اس سے بھی امداد لی ہی۔

قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش بادشاہانِ ہند کی تاریخ تاج المآثر

جس کو حسن نظامی نے ۶۲۶ھ ۱۲۳۱-۳۲ء میں تصنیف کیا۔ اس سے بھی ہم کو دو ایک جگہ ضمناً
مدد ملی۔ ان کے بعد قاضی منہاج السراج کی مشہور تاریخ طبقات ناصری ہے جو دہلی کے
بادشاہ ناصر الدین کے زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ افسوس ہے کہ اس نے ہمارے مضمون پر کوئی
روشنی نہ ڈالی۔ مگر یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ اس قابل اعتبار مگر بخیل مورخ نے
جب محمود غزنوی جیسے عظیم الشان بادشاہ کو صرف چند سطور دیں تو محمود کے اہالی موالیوں کا
اس میں کیا ذکر ہوتا۔

آٹھویں صدی ہجری کی تواریخ جن میں سپہ سالار مسعود غازی کا ذکر ہے: سفرنامہ ابن بطوطہ فیروز شاہی

اب اِن کے بعد اُن کتابوں کا نمبر آتا ہے جن میں
براہ راست سپہ سالار مسعود غازی کا ذکر آتا ہے۔ ان کا
سلسلہ آٹھویں صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو کر
اب تک جاری ہے۔ ان میں سب سے پہلا نمبر مشہور
عرب سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامہ کا ہے جس کا اُردو
ترجمہ مولوی محمد حسین صاحب دہلوی نے عجائب الاسفار کے نام سے شائع کیا۔ یہ سیاح
محمد شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے ساتھ ۷۴۲ھ ۱۳۴۱ء کے آس پاس سپہ سالار مسعود غازی کے
مزار پر بہرائچ میں حاضر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ مجمع کی زیادتی کی وجہ سے وہ اور بادشاہ
مزار کے اندر نہ جا سکے کیوں کہ صرف ایک دروازہ تھا۔ چھ سو سال سے زائد کی شہادت
مزار کے موجودگی کی بابت کیا کم ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب ہمارے لئے اہم ہے
اس کے بعد فیروز شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے زمانہ میں ۷۵۸ھ ۱۳۵۷ء میں مولانا ضیاء الدین
برنی کی مشہور تاریخ فیروز شاہی تصنیف ہوئی۔ اس میں بھی سپہ سالار موصوف کا ذکر ہے
جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا۔
اس کے بعد اسی بادشاہ کے زمانہ میں دوسری تاریخ اسی نام کی ۷۹۰ھ میں
مورخ شمس سراج عفیف نے تصنیف کی۔ اس میں بھی سپہ سالار مسعود غازی کا ذکر،

مزار پر بادشاہ کی حاضری کے سلسلہ میں ہے۔ اسی بادشاہ نے ایک چھوٹا سا رسالہ فتوحات فیروز شاہی کے نام سے تصنیف کیا جو اب کم یاب ہے۔ ہم تک صرف اس کا انگریزی ترجمہ ایلیٹ اور ڈاؤسن کے ذریعہ پہنچا۔ اس میں سپہ سالار مسعود غازی کا تو کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر اس سے اس امر کا قیاس ہوتا ہے کہ یہاں کے مزار کی عمارتیں فیروز شاہ تغلق نے تعمیر کرائیں۔

عہد اکبری کی تاریخیں: طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اکبر نامہ، منتخب التواریخ

ان کے بعد عہد اکبری کی تاریخوں کا نمبر آتا ہے۔ یہ زمانہ تاریخ نویسی کے لئے مشہور تھا اور کیوں نہ ہوتا اس بغیر پڑھے لکھے بادشاہ کو خود تاریخ سے شوق تھا اور اس کے دل میں مورخین کی قدر تھی۔ اس زمانہ کے مورخین نے تاریخی معلومات میں چار چاند لگائے۔

ان میں سب سے اوّل مولانا نظام الدین کی طبقات اکبری ہے جو ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲-۹۳ء میں تصنیف ہوئی۔ پھر ملّا احمد ٹھٹوی کی تاریخ فرشتہ ہے جو ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۶ء میں تصنیف ہوئی۔ علامہ ابو الفضل کا اکبر نامہ ہے جو اس سے بعد میں تصنیف ہوا۔ صاف گو اور حق بات کہنے سے نہ ڈرنے والے مورخ عبد القادر بدایونی کی تاریخ منتخب التواریخ ہے جو اکبر کے انتقال کے فوراً ہی بعد شائع ہو گئی۔

ان سب تاریخوں میں ہمارے ہیرو کا ذکر ہے جس کی تفصیلات آئندہ آئیں گی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان تاریخوں کا زمانہ سپہ سالار موصوف کے زمانہ سے نسبتاً دور ہے مگر ہم ان کی روایتوں کو محض اسی بنا پر رد کر کے ناقابل اعتبار نہیں ٹھیرا سکتے۔ ان کی اہمیت دو وجہ سے زیادہ ہے۔ اول تو یہ کہ جن تاریخوں سے ان مورخین نے کام لیا وہ آج دنیا سے غائب ہیں اور وہ مصالحہ اگر ہمارے سامنے ہوتا تو سپہ سالار موصوف کے حالات پر تاریکی کا وہ پردہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانہ میں قدم قدم پر

تاریخی اسناد کا حوالہ دینے کا رواج نہ تھا اور اسی وجہ سے ان مورخین نے بھی پورے طور پر اپنی اسناد کا ذکر نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ سب کتابیں سپہ سالار مسعود غازی کی مخصوص تاریخ مرأت مسعودی سے بہت قبل کی ہیں اور اُن کا سلسلہ آج سے چھ سو برس (۶۰۰) قبل شروع ہوتا ہے۔ علاوہ بریں یہ تواریخ اس خیال کو قطعی غلط ثابت کرتی ہے کہ مرأت مسعودی سے قبل سپہ سالار موصوف کی بابت کوئی مسالہ نہیں ہے یا یہ کہ مرأۃ مسعودی نے سب سے قبل من گڑھت باتیں لکھدیں۔

محاربات ہند
باقیات الصالحات
طبقات الاولیا

یہاں ایک ایسی تاریخ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو مرأت مسعودی سے بہت قبل کی بتائی جاتی ہے مگر بوجہ نایاب ہونے کے ہم اُس کو نہ دیکھ سکے اور اُس کے واقعی وجود کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قاصر ہیں۔ اگر کوئی صاحب نظر اس کو ڈھونڈھ نکالیں تو تاریخی دنیا پر بڑا احسان کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سید علاء الدین عالم شاہ دہلوی بدایونی کے زمانہ میں اور ۸۷۳ھ ۱۴۶۸ء کے آس پاس ملا نور بدخشانی نے ایک تاریخ محاربات سعید تصنیف کی جس کا اب پتہ نہیں ہے جس میں سپہ سالار موصوف کے غزوات کے مفصل حالات درج ہیں۔ اس کا حوالہ ایک صاحب عبد الوالی صاحب بدایونی نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب باقیات الصالحات میں دیا ہے جو ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷-۴۸ء میں تصنیف ہوئی اور جو شرح ہے ایک اور غیر مطبوعہ تاریخ کی جس کا نام طبقات الاولیا ہے اور جس کو شیخ سعد الدین بصیر ملتانی بدایونی نے ۱۱۶۰ھ ۱۷۴۷ء میں تصنیف کیا۔ یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ محاربات ہند واقعی کوئی کتاب تھی مگر بظاہر ان مصنفین کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہماری نگاہ سے نہیں گذریں۔

مرأۃ مسعودی کے بعد کی تاریخیں:
تقویم التاریخ

مرأۃ مسعودی کا مفصل ذکر تو آگے آئے گا یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ یہ تاریخ

نورالدین جہانگیر بادشاہ دہلی کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اس تاریخ کے بعد ہم کو متعدد تاریخیں ملتی ہیں جنھوں نے تھوڑا یا بہت سپہ سالار مسعود غازی کا ذکر کیا۔ ہم صرف ان کے ناموں پر اکتفا کرتے ہیں کیوں کہ انھوں نے جو کچھ مسالہ لیا غالباً وہ مرآۃ مسعودی سے لیا ہی۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہی کہ دیگر کتب تواریخ ان کے سامنے نہ ہوں۔ ان میں سے سب سے اول ایک چھوٹی سی جنتری تقویم التاریخ ہی۔ یہ ایک تاریخی جدول ہی جس کو مصطفےٰ بن عبداللہ المعروف بہ حاجی خلیفہ نے ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء یا ۱۰۷۵ھ ۱۶۶۴ء میں تصنیف کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ہم کو ریاست رام پور کے کتاب خانہ میں ملا۔ یہ ایک نادر قلمی نسخہ ہی بقول مصنف کے ایک صاحب استنبول کے دفتر میں ملازم تھے انھوں نے تاریخ کی تیرہ سو جلدیں پڑھنے کے بعد ایک عام تاریخ لکھی جس کا نام تاریخ کبیر تھا اور جو ترکی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی ہے۔ تقویم التاریخ اسی کی جدول ہی اور اس میں چیدہ چیدہ واقعات بقید سن درج ہیں۔ جو نسخہ ہم کو دیکھنے کو ملا وہ ۱۱۰۲ھ ۱۷۵۸ء کا لکھا ہوا ہی اور اس کا ایک نسخہ امپریل لائبریری کلکتہ کے ذخیرہ بوہار میں ہی۔ اگر یہ جدول دیگر تاریخوں پر مبنی ہی تو اس سے مرآۃ مسعودی کی تائید ہوتی ہی اور اگر مرآۃ مسعودی سے ماخوذ ہی تو اس سے نہ محض مرآۃ مسعودی کے زمانۂ تصنیف پر روشنی پڑتی ہی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ تصنیف کے تھوڑے ہی دن بعد مرآۃ مسعودی کی شہرت ہندوستان سے باہر پہونچ گئی تھی۔

مرآۃ مسعودی کے کچھ عرصہ بعد اور حال کی کتابوں میں اخبار الاخیار مصنفہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور سیر المتاخرین ہی جو سنہ میں تصنیف ہوئی۔ مفتاح التاریخ مصنفہ ٹامس ولیم بیل ہی جو ۱۸۴۸ء میں تصنیف ہوئی۔ اخبار الاخیار فی تاریخ الاخیار نامی پریس کان پور سے شائع ہوئی بنگال کی مشہور تاریخ ریاض السلاطین مؤلفہ مولوی غلام حسین ہی جس کو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ نے شائع کیا۔ تاریخ گڑھا منک پور مصنفہ عبداللہ خاں علوی مطبوعہ قیصر ہند پریس الہ آباد۔ شہادت نامہ مصنفہ حضرت

شاہ علی انور قلندر رحمۃ اللہ اصح المطابع لکھنؤ۔ داب حیدری مصنفہ سید جلیل قریشی بخشی پریس کان پور۔ تقصار جیود الاحرار من تنکار جنود الابرار مصنفہ نواب علی حسن خاں ہے۔ تاریخ ریاض المحبت ہی جس کو نواب محبت خاں نے انیسویں صدی کے اوائل میں تصنیف کیا۔ مرآۃ الانساب مصنفہ مولانا شاہ ضیار الدین احمد نقشبندی امروہوی۔ زمانۂ متوسط کی تاریخ ہند مصنفہ سی وی ویدیا پونہ۔ کرانولوجی آف انڈیا مصنفہ بے بل ڈف مسنز ڈبلیو آر ریکمر۔ مختلف اضلاع کے ڈسٹرکٹ گزیٹر۔ اور گورنمنٹ کی رپورٹ ہائے آثار الصنادید ہیں جن میں ہم کو سپہ سالار موصوف کا ذکر ملتا ہے۔ اسی سلسلہ میں محمود غزنوی کی سوانح جس کو ڈاکٹر ناظم صدیقی علیگ نے بڑی تحقیقات اور محنت اور قابلیت سے تصنیف کیا اور جس کا نام لائف اینڈ ٹائمس آف محمود آف غزنہ ہے۔ ہم کو بڑی مدد ملی۔ اسی طریقہ سے اگر ہم یہاں پر سرہنری ایلیٹ کی اُس تاریخ ہند کا جو آٹھ جلدوں میں ہے جس کا نام "تاریخ ہندوستان ہندوستانی مورخین کے زبانی" ہے ذکر نہ کریں تو احسان فراموشی ہوگی۔ سرہنری ایلیٹ نے بہت سی فارسی زبان کی تاریخوں کے اُن اقتباسات کا ترجمہ کرکے جن کا تعلق ہندوستان سے ہے ہمیشہ کے لئے اُن کو محفوظ کر دیا اور تاریخی دنیا پر ایک بڑا احسان کیا۔

ہندو مورخین کی تواریخ

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہندو مورخین کی کتابوں اور لٹریچر میں بھی کہیں سپہ سالار موصوف کا ذکر ملتا ہے یا نہیں۔ سُنیے۔ اس معاملہ میں ہم کو بڑی نا اُمیدی ہوئی۔ اگرچہ ہندو لٹریچر میں براہ راست سپہ سالار موصوف کا تذکرہ نہ ملنا تعجبات سے نہیں ہے۔ بد قسمتی سے اوّل تو ہندو مورخین نے تاریخیں ہی بہت کم لکھیں اور جو لکھیں اُن میں سے بعض افسانوں اور واقعات کا مجموعہ ہیں یا اُن میں دین اور دنیا دونوں ملے جُلے ہیں۔ ہمارے ابنائے وطن بُرا نہ مانیں اگر ہم عرض کریں کہ اُس زمانہ میں بہ نسبت مسلمانوں کے ہندوؤں میں تاریخ نویسی کا نداق اور شوق بہت ہی کم تھا جیسا کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اور دیگر انگریز مورخین نے

شکایت کی ہے۔ اُن کے یہاں بھاٹ، شعرا اور داستان گوؤں کا رواج تھا جن میں روایتیں سینہ بسینہ چلتی تھیں اور جیوں جیوں یہ دل بہلانے والا طبقہ کم ہوتا گیا روایتیں ضائع ہوتی گئیں بعض صاحبوں نے جن میں کرنل ٹاڈ مصنف تاریخ راجستھان بھی ہیں ان روایتوں کو سپرد قلم کرنے کی کوشش کی۔ ہم تک چند ہندو تواریخ ضرور پہونچیں جو سپہ سالار موصوف کے زمانہ کے بعد تصنیف ہوئیں۔ مثلاً تاریخ کشمیر راج ترنگنی مصنفہ کلہانا پنڈت جس میں محمودی حملوں کا کچھ حال ہے۔ اس سے ضمناً دو ایک جگہ ہمارے مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔

اسی طرح سے پرتھوی راج چوہان کے درباری شاعر چند بردائی کے "پرتھوی راج راسلو" جس کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ جغرافیہ کا دیا ممان۔ کارہائے وکرامانکا نیا چند سوری کی تصنیف مہا کاویہ ہمرا۔ اسکند پُران وغیرہ۔ یا چند ناٹک اور ڈرامے اور راجاؤں کے تعریفی قصے ہیں۔ مگر یہ سب کتابیں مخصوص زمانے اور مخصوص راجاؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان کی عام تواریخ کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ ہاں ان کی جگہ چند سو سنگین اور مسی کتبوں نے لی جن میں کہیں کہیں ہمارا یعنی مسلمانوں کا ذکر ہے۔ اس کی تفصیل آگے مناسب موقع پر آئے گی۔ پھر جو ہندو لٹریچر موجود ہے اُس کے بارے میں ہمارا تو کیا کہنا بعض دفعہ ہندو علما میں اُن کے معنی اور مطلب پہ طرح طرح کی چہ میگوئیاں رہتی ہیں کیوں کہ وہ تاج المآثر اور مسلمانوں کی بعض دیگر کتابوں کی طرح استعاروں اور تشبیہوں سے پُر ہیں۔ اُن سے جلد مطلب نکالنا کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں ہے۔ اور افسانوں سے واقعات کو جُدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ بڑے سمندر سے دو چار موتی نکالنا۔ حال کی دو چار انگریزی تاریخیں یا داستانیں مثلاً تاریخ راجستھان مصنفہ ٹاڈ صاحب، یا ویدیا کی تاریخ ہند نے ہندو لٹریچر سے ضرور تھوڑا بہت کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور ضروری امر قابل گزارش یہ ہے کہ

مرآۃ مسعودی کے مصنف مولانا عبدالرحمن چشتی نے ضرور ایک ہندو مصنف اور بزرگ آچاریہ منی کی تاریخ کا حوالہ دیا ہے مگر وہ نہ تو ہم کو مل سکی اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ واقعی وہ کوئی تاریخ ہے اور اس کتاب کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود ہے یا نہیں اور یہ بزرگ کس پایہ کے تھے۔ مگر بظاہر مولانا کی بات نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہم اسلامی لٹریچر سے کام نہ لیں تو کیا کریں۔ ناظرین ہماری اس دقت کو سمجھ سکتے ہیں۔

(۲) مرآۃ مسعودی

اس کے بعد ہم اپنے مضمون کے ماخذ کی دوسری قسم یعنی سپہ سالار موصوف کی مخصوص تاریخ مرآۃ مسعودی پر آتے ہیں صاف ظاہر ہے کہ اس کتاب پر تنقید کے واسطے کسی قدر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ مرآۃ مسعودی کی تصنیف کا صحیح سال تو معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے مصنف مولانا عبدالرحمن چشتی نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ یہ تاریخ نورالدین جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ یہ زمانہ سنہ ۱۰۱۴ھ مطابق سنہ ۱۶۰۵ء سے لے کر سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق سنہ ۱۶۲۷ء تک تھا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ مرآۃ مسعودی سپہ سالار مسعود غازی کے چھ سو برس بعد تصنیف ہوئی۔ یہ زمانہ تاریخی اعتبار سے واقعہ متعلقہ سے بہت دور ہے اس لئے ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی تائید دیگر کتب سے یا اندرونی شہادت سے ہوتی ہے یا نہیں اور اسی بحث کے نتیجہ پر اس تاریخ کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ مرآۃ مسعودی کے مصنف خود ان کے قول کے مطابق ایک عرصہ تک سپہ سالار موصوف کے مزار پر حاضر رہے۔ انہیں کی تصنیف ایک دوسری تاریخ مرآۃ الاسرار ہے جس میں بہت مختصر حالات سپہ سالار مسعود غازی کے اور چند اولیائے کرام کے ہیں۔ ان دونوں تاریخوں کے غیر مطبوعہ نسخے اگرچہ کمیاب ہیں مگر پھر بھی کئی ایک جگہ موجود ہیں۔ ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی میں نواب عبدالسلام خاں مرحوم رامپوری کے ذخیرہ میں ہے۔ ایک نسخہ خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ میں ہے۔ چھ نسخے مرآۃ مسعودی کے اور دو نسخے مرآۃ الاسرار کے ہم نے دیکھے۔ پٹنہ لائبریری کی فہرست (جلد ہفتم سوانح عمری) میں ہم کو

مولانا عبدالرحمٰن چشتی کا مختصر حال یہ ملا کہ وہ ۱۶۵۴ء یعنی عہد شاہجہانی میں زندہ تھے مرآۃ الاسرار ۱۶۴۹ء اور مرآۃ مداری یعنی حالات شاہ بدیع الدین مدار ۱۶۵۳ء میں تصنیف کیں۔ شجرہ اُن کا یہ تھا عبدالرحمٰن بن عبدالرسول، بن قاسم بن شاہ بدہا عباسی العلوی۔ اُن کے مورث علاء الدین خلجی بادشاہ دہلی کے زمانہ میں بلخ سے آئے اور ردولی ضلع بارہ بنکی میں آباد ہوئے اور ردولی کی درگاہ کے سجادہ نشین اسی خاندان سے ہوئے۔ ایک مولانا عبدالرحمٰن واعظ کا ذکر ابوالفضل نے اکبرنامہ میں کیا ہی اور لکھا ہی کہ بادشاہ نے ان کو حاجیوں کا قافلہ سالار مقرر کیا اور فتحپور سیکری کی مسجد میں ان کا وعظ سنا۔ اگر یہ وہی عبدالرحمٰن تھے جنھوں نے مرآۃ مسعودی لکھی (حاجی یہ بھی تھے جیسا کہ خود اُن کا قول ہی) تو اورنگ زیب کے زمانہ تک اُن کا زندہ رہنا اگرچہ ناممکن اور تعجبات سے نہیں ہی مگر ایسا کم ہوتا ہی۔ (اکبرنامہ ترجمہ انگریزی صفحہ ۲۷۲ باب ۴۴)

آخری تاجدار اودھ کے زمانہ میں ایک صاحب عنایت حسین بلگرامی اودھ کے شاہی ملازمین سے تھے اُنھوں نے مرآۃ مسعودی کا اُردو ترجمہ اور کچھ اپنی رائے ملا کر شائع کیا اور اُسی کی بناء پر عوام بعض مرتبہ کہنے لگتے ہیں کہ مرآۃ مسعودی چھپ گئی ہی عنایت حسین بلگرامی لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن چشتی مصنف مرآۃ مسعودی ۱۰۹۴ھ یعنی ۱۶۸۳ء عہد اورنگ زیب عالمگیر تک زندہ رہے۔ اس حساب سے مرآۃ مسعودی غالباً جہانگیر بادشاہ کے آخر عہد میں تصنیف ہوئی ہوگی۔ بہرحال مرآۃ مسعودی اور مرآۃ الاسرار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ مصنف مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اگرچہ اُن کو واقعات اور سُنی ہوئی روایتوں کی آمیزش کی زیادہ پروا نہ تھی اور نہ اُنھوں نے پورے طور پر پُرانے زمانہ کے دستور کے مطابق اسناد کے حوالے دیئے اور نہ سنین واقعات بتائے۔ اسی وجہ سے مرآۃ مسعودی میں بعض ایسے واقعات ہیں جن کا ذکر دوسری کتب تاریخ میں نہیں ملتا اسی وجہ سے اور نیز چھ سو برس کے بُعد کے سبب سے بعض حضرات نے مرآۃ مسعودی کو

ناقابل اعتنا ٹھیرایا اور مولوی محمد حسین دہلوی نے ترجمہ عجائب الاسفار میں اُس کو چوں چول کا مربّا خیال کیا۔ اسی وجہ سے ہمارے لئے ضروری ہی کہ اس کتاب پر گہری نظر ڈالیں تاکہ اُس کا حسن و قبح معلوم ہو جائے۔ مرآۃ مسعودی کے مصنف نے کتاب کے شروع میں لکھا ہی کہ اُس کا ماخذ ایک اور پرانی تاریخ تھی جس کا نام تاریخ ملّا محمد غزنوی تھا اور یہ کہ ملّا محمد ہندوستان میں محمود غزنوی کے ساتھ آئے۔ تاریخ ملّا محمد غزنوی کا اب کہیں پتا نہیں ہی اور باوجود تلاش کے سرہنری ایلیٹ ایسے محقق اور کھوج لگانے والے کو بھی یہ کتاب نہیں ملی۔ بقول سرہنری ایلیٹ (جلد دوم ضمیمہ) و ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ مترجم البیرونی (دیباچہ انگریزی مترجم) کے اگر تاریخ ملّا محمد غزنوی مل جاتی تو آج نہ معلوم محمود غزنوی اور ہمارے ہیرو سپہ سالار مسعود غازی پر کیا کیا مزید روشنی پڑتی۔ ہم کو مزار سپہ سالار موصوف کے خدام میں سے ایک صاحب کے پاس ایک کتاب فارسی کے چند اوراق پریشان ملے جن میں محمود کی ایشیائی لڑائیوں کے کچھ حالات تھے۔ خاص کر شار غرجستان (گوڑگانا) سے جنگ کے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اوراق تاریخ ملّا محمد غزنوی کے تھے یا نہیں مگر اس کتاب کی عبارت مبالغوں سے پُر تھی۔ مرآۃ مسعودی کے متعلق سرہنری ایلیٹ جیسے قابل محقق نے اپنی رائے (جلد دوم صفحہ ۵۱۳) پر ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ " یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب (مرآۃ مسعودی) جھوٹی ہی۔ اُس نے روضۃ الصفا (مصنفہ میر خوند ۹۰۳ھ ۹۸-۱۴۹۷ء) کے جو حوالے دیئے ہیں وہ اگرچہ مختصر ہیں مگر صحیح۔ قطع نظر اُس کے ہیرو سپہ سالار غازی کے جو حالات مرآۃ مسعودی نے ہندوؤں پر مسلمانوں کے حملوں کے لکھے ہیں اُن کی تائید دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہی۔ اُس کے (یعنی مرآۃ مسعودی کے) حالات ماخوذ ہیں کہ من گھڑت۔ اُس نے ایک ہم عصر تاریخ (ملّا محمد غزنوی کا حوالہ دیا ہی جس کا پتا ہم کو نہیں لگا۔ یہ ممکن ہی کہ مرآۃ مسعودی کے بعض عجیب اور نئے بیانات سچے ہوں یا اُن سے دوسرے مصنفین پر روشنی پڑ سکے۔ اگرچہ بیانات کا ایسی حالت میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا

جب کہ اُن کی تائید نہ ہو" یہ رائے ایک غیر جانب دار اور غیر مذہب کے فاضل مورخ
کی ہے۔ اس مصنف کے بنائے ہوئے قاعدے اور اصول کے مطابق جن کا مندرجہ بالا سطور
میں ذکر ہے دیکھنا یہ ہے کہ مرآۃ مسعودی کی تائید دوسری کتابوں اور واقعات مسلمہ سے
کہاں تک ہوتی ہے۔ جس حد تک اور جس قدر تائید اس قسم کی ہم کو دیگر مستند ذرائع سے
مل سکے گی اُتنی ہی تاریخ مرآۃ مسعودی تاریخی کسوٹی پر سچی اُترے گی باقی غلط۔
ہم تفصیل کے ساتھ دکھائیں گے کہ اکثر بیانات میں مرآۃ مسعودی کی تائید نہ محض اُس کے
اندرونی شہادت سے بلکہ دیگر کتب تاریخ و سیر سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اقتباس، اختصار
اور ماخذ میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ مرآۃ مسعودی میں بھی ہے یعنی مرآۃ مسعودی نے
سپہ سالار موصوف کی بابت بعض واقعات کو بالکل اُڑا دیا ہے جو ہم کو دوسری کتابوں سے
یا مقامی روایتوں سے ملتے ہیں۔ اسی طریقہ سے بعض موقعوں پر مرآۃ مسعودی نے
ملّا محمد غزنوی کے اقتباس دینے کی بجائے اپنی رائے کو بھی شامل کر دیا ہے مگر ان وجوہ سے
پوری کتاب ناقابل اعتبار نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو آج بہت سی مستند تاریخیں
جن کی روایات دوسری تاریخوں سے مختلف ہیں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے جانے کے
قابل قرار پاتیں۔ ہم ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ اُن بیانات کو خارج کر دیں گے
جن کی تائید دوسرے اسناد سے نہیں ہوتی۔ اسی طریقہ سے بعض بیانات ایسے بھی ہیں جو
باوجود تائید نہ ملنے کے عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ ہماری ناچیز رائے میں جہاں کہیں مولانا
عبدالرحمن چشتی نے غلطی کی ہے اُس کو ہم نہایت صفائی سے ظاہر کر کے فیصلہ ناظرین پر
چھوڑ دیں گے۔ مرآۃ مسعودی میں بعض لوگوں کے اور بعض مقامات کے جو غیر معروف
اور غیر مانوس نام درج ہیں جن کا اب پتا نہیں چلتا اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غیر مطبوعہ
ہونے اور آج سے تین سو سال قبل سے بار بار مختلف لوگوں کے ہاتھوں سے لکھے جانے کی
بدولت کہیں کہیں عبارتیں اصل سے ہٹ کر کچھ سے کچھ ہو گئیں جس نے ہماری دقّت کو اور

بھی بڑھا دیا۔ مگر پھر بھی ہم نے ان سطوروں میں اپنی بساط کے مطابق اُن کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسوس ہے کہ بعض اصحاب نے مرآۃ مسعودی پر حاشیئے چڑھا کر اور اپنی رائے ملا کر ایسے افسانے چھاپ دیئے کہ جنھوں نے غیر مسلم حضرات کو سپہ سالار مسعود غازی کا مضحکہ اُڑانے یا اُن پر اتّہام لگانے اور اُن کی بادقعت ہستی کو محض ایک ڈھونگ قرار دینے کی جرأت دلائی۔ سپہ سالار موصوف کی روح کو اس شکایت کا حق حاصل ہے کہ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

مرآۃ مسعودی کے مختلف نسخے

ہم کو اس کتاب کے چھ ۶ نسخے ملے۔ ایک نسخہ سپہ سالار موصوف کی درگاہ کے کتاب خانہ میں۔ یہ نسخہ صاف مگر غلط لکھا ہوا تھا اور حال میں میاں رجب کوتوال کی درگاہ واقعہ ہٹیلہ متصل بہرائچ کے خدام کے نسخہ کی نقل تھا۔ دوسرا نسخہ درگاہ ہٹیلہ کے خدام سے ملا۔ ان دونوں نسخوں میں بہت تحریفات ہیں اور غالباً ان تحریفی اور زائد عبارتوں کا منشا یہ تھا کہ میاں رجب کوتوال کو جو عام طور سے رجب سالار کے نام سے مشہور ہیں سپہ سالار مسعود غازی کا رشتہ دار ثابت کیا جائے۔ تیسرا نسخہ ہم کو خان بہادر سید اولاد حسین صاحب تعلقہ دار بہرائچ کے کتاب خانہ سے ملا۔ یہ صاف اور صحیح لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء یعنی آج سے سو سال قبل نقل کیا گیا تھا۔ چوتھا نسخہ شیخ سردار علی صاحب خادم درگاہ سپہ سالار مسعود غازی کے پاس ملا۔ اس کے کچھ اوراق ضائع ہو گئے ہیں اور اگرچہ خط اس کا اچھا نہیں ہے مگر عبارت صحیح ہے۔ کاغذ اور روشنائی کے اعتبار سے ایک عرصہ کا نقل کیا ہوا ہے اور عبارت میں خان بہادر سید اولاد حسین صاحب کے نسخے سے ملتا ہے۔ پانچواں نسخہ ہم کو مولوی محمد سلیمان صاحب رئیس بدایوں کے پاس ملا۔ یہ بہت صاف نہیں ہے اور اس میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ چھٹا نسخہ ہم کو مسلم یونیورسٹی کے مشرقی کتاب خانہ میں مولانا احسان اللہ عباسی گورکھپوری کے

ذخیرہ میں ملا۔ یہ بھی کچھ بہت صاف لکھا ہوا نہیں ہے۔ ان سب نسخوں میں سب سے اچھا خان بہادر سید اولاد حسین صاحب والا نسخہ ہے اور اُسی سے ایک نقل لے کر او رمقابلہ کرا کے ہم نے درگاہ سپہ سالار موصوف کی لائبریری میں رکھدی ہے۔

سرہنری ایلیٹ نے مرآۃ مسعودی کے بعض اقتباسات کے ترجمے اپنی مشہور تاریخ ہند کے جلد دوم میں بطور ضمیمہ کے دیئے ہیں اور اس طریقہ سے مرآۃ مسعودی کو دستبرد زمانہ سے محفوظ کر کے تاریخی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جو نسخہ سرہنری ایلیٹ کے سامنے تھا اُس میں بھی کتابت کی غلطیاں تھیں مثلاً اُنھوں نے مقام کاہلیر کو کابلیز اور صاحب ہرمز کو حاجب ہرمز لکھا ہے۔ اگر کسی کتاب خانہ میں یا کسی صاحب کی پرائیویٹ لائبریری میں کوئی نسخہ زمانۂ تصنیف کا یا اُن کے آس پاس کا لکھا ہوا ہو اور وہ ہم کو بتا دیں تو نہ محض ہم کو بلکہ تاریخی دنیا کو مرہونِ منت بنائیں گے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ سپہ سالار موصوف کی سوانح حیات کے معلوم کرنے میں مرآۃ مسعودی کا پایہ کس قدر اہم اور بلند ہے۔

کتبہ جات اب ہم اپنے ماخذ کے تیسری قسم یعنی کتبہ جات سنگین و مسی پر آتے ہیں اس قسم کی تاریخی شہادت اٹل سمجھی جاتی ہے بشرطیکہ اُس کی عبارت صاف ہو۔ مبہم نہ ہو۔ اور سمجھنے اور پڑھنے میں شبہ نہ رہے کیوں کہ گھٹانے اور بڑھانے کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔

بدقسمتی سے اس قسم کی شہادت ہمارے مضمون کی بابت ہی کیا بلکہ ہندوستان کی عام تاریخ کے بارے میں بھی بہت کم ہے اور نہایت غیر مسلسل۔ یوں تو کتبہ جات کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے مگر اُن کا تعلق زیادہ تر اُن عطیات سے ہے جو راجاؤں نے برہمنوں اور پجاریوں کو یا مندروں کو دیئے۔ تاریخ کے دیگر واقعات پر اُن سے بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ حکمران خاندانوں کے شجرے اُن سے

مرتّب ہو جاتے ہیں یا بعض لڑائیوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے یا کچھ مقامات کے ناموں کا
جواب کچھ سے کچھ رہ گئے ہیں پتا چل جاتا ہے۔ خدا بھلا کرے پروفیسر کیل ہارن، جنرل
کننگ ہم، ڈاکٹر فوہرو، سر مونیر ولیمس، مسٹر فلیٹ، ڈاکٹر اسپرنگر اور سرکاری
ناظمانِ محکمۂ آثار قدیم اور دیگر یورپین مستشرقین کا جنھوں نے ان کتبہ جات کے ترجمے
انگریزی زبان میں کرکے اُن کو محفوظ کر دیا۔ اس سلسلہ میں ایپی گریفیا انڈیکا Epegraphia Indica
کورپس انس کرپشنم انڈی کیرم (Corpuoinscriptionem Indi Carum) انڈین انٹی کو اری (Indien Antiquay)
انھیں حضرات کی محنتوں کا نتیجہ ہیں جس سے تاریخ کے بھوکے اور پیاسے بہت کچھ اپنی
تسلی کر لیتے ہیں۔ ورنہ بد قسمتی سے مسلمان تو سنسکرت زبان کے سیکھنے سے کوسوں بھاگتے ہیں

کتبۂ لکھن پور

اس قسم کے کتبہ جات میں ہمارے مضمون کے لئے سب سے اہم وہ کتبۂ سنگین ہے جو ۱۸۸۷ء میں بدایوں میں برآمد ہوا اور اب لکھنؤ کے
عجائب خانہ میں رکھا ہے۔ یہ لکھن پور کے کتبہ کے نام سے مشہور ہے۔ بدایوں کے نام اور
راجاؤں کے خاندان پر اور ہمارے مضمون پر اس سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مشہور
جرمنی عالم پروفیسر کیل ہارن نے کلکتہ میں اس کا ترجمہ سنسکرت سے انگریزی میں کیا اور
وہ ایپی گریفیا انڈیکا Epegraphia Indica جلد اول صفحہ ۶۱ لغایتہ ۶۶ میں اور
لکھنؤ کے عجائب خانہ کی فہرست کتبہ جات میں درج ہے۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی۔
مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی غالباً بدایوں آئے۔

کرن دیو

اس کے بعد اُس پتھر کے کتبہ کا نمبر ہے جو کرن دیو پسر گنگ دیو کالاچھری راجپوت راجہ ریاست چھیدی (متصل جبل پور) کا ہے اور جس کا ذکر ویدیا نے
اپنی تاریخ کی جلد سوم صفحات ۱۲۹ و ۱۸۸۔۱۸۹ پر کیا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے
سپہ سالار مسعود غازی کے ہم عصر تھے اور اُن کے مخالف گنگ دیو کا ذکر بیہقی نے

اُس حملہ کے سلسلہ میں کیا ہے جو مسعود غزنوی کے جنرل احمد نیال تگین نے بنارس پر ۱۰۳۳ء کے آس پاس کیا۔ ابوریحان البیرونی لکھتا ہے کہ بنارس گنگ دیو کی حکومت میں شامل تھا۔ بقول ایپی گریفیا انڈیکا (جلد دوم صفحات ۲۹۷ لغایتہ ۳۰۴) کرن دیو راجہ کا زمانہ ۱۰۴۲ء سے ۱۰۸۰ء تک تھا۔ یہ سپہ سالار موصوف کے زمانہ میں اپنے باپ گنگ دیو کا راج پتر یا ولی عہد تھا۔ کرن دیو کے کتبہ نے لکھا ہے کہ وہ ملک گیرا (موجودہ کانگڑا پنجاب) تک گیا اور اُس نے ملک کو ناپاک لوگوں سے صاف کیا۔ مرآۃ مسعودی میں ہم کو گنگ اور کرن کے نام بہرائچ کی جنگ کے سلسلہ میں ملتے ہیں۔

اس کے بعد ناگ پور کا وہ پتھر کا کتبہ ہے جس کا ذکر ایپی گریفیا انڈیکا جلد دوم صفحات ۱۸۰ لغایتہ ۱۹۰ پر ہے۔ یہ سمت ۱۱۶۱ بکرمی مطابق ۱۱۰۴ء کا ہے۔

راجہ لکھشما دیو یہ کہتا ہے کہ راجہ لکھشما دیو نے جو مالوہ کے پرجا راجاؤں سے تھا ترکوں سے لڑ کر اُن کو آسانی سے نکال دیا۔ جب کہ یہ راجہ دریائے وانکشو کے کنارہ پر مقیم تھا (بقول سر مونیر ولیمس یہ دریا گنگا کی ایک شاخ تھی یا ممکن ہے کہ یہ دریائے بان گنگا ہو جو اَب کانگڑہ کے قریب پنجاب میں ہے) اس میں سپہ سالار موصوف کا نام نہیں ہے اور کسی کتبہ میں بھی صاف نہیں ہے مگر جیسا کہ ہم آئندہ دکھائیں گے اس سے ہمارے مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ بان نام کی ایک چھوٹی سی ندی آج کل اضلاع بجنور اور مراد آباد میں بھی ہے۔

ارنو راجہ اجمیر پونا کے مورخ ویدیا نے اپنی تاریخ ہند کی جلد سوم صفحہ ۱۴۸ پر ارنو (آنہ) چوہان راجہ اجمیر اور سانبھر کا ذکر کیا ہے اس راجہ کا زمانہ ۱۱۰۸ء کے لگ بھگ تھا۔ اس سلسلہ میں اُس کے ایک پتھر کے کتبہ کا حوالہ دیا ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ راجہ نے انا ساگر تال بنا کر اس مقام کو جس کو مسلمانوں نے ناپاک کر دیا تھا پاک کیا۔ اس کا ذکر ٹاڈ صاحب نے بھی اپنی کتاب راجستھان میں کیا ہے۔ یہ کتبہ ہمارے

مضمون پر روشنی ڈالتا ہی جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا۔

گووند چندر گھدوال

قنوج کے راجہ گووند چندر گھدوال کا ایک کتبہ ۱۱۱۶ء کا ہی جس کا ترجمہ انگریزی کتاب انڈین اینٹی کواری جلد ۱۸ صفحہ ۱۵ پر ہی اور جس کا مطلب یہ ہی کہ راجہ نے مسلمانوں سے لڑکر اُن کو دشمنی بھول جانے پر مجبور کیا۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی۔ مگر اس سے بھی ہم کو مدد ملی۔

چندر دیو گھدوال

اسی راجہ کے پوتے اور قنوج کے آخری ہندو راجہ چندر دیو گھدوال کا ایک کتبہ ۱۱۷۵ء کا جس کا ذکر انڈین اینٹی کواری جلد ۱۸ صفحہ ۱۳۳ پر کیا ہی۔ اس کا مطلب یہ ہی کہ اس کے باپ وجے چندر پسر گووند چندر نے ہمرا (مسلمان) لوگوں سے لڑکر مصیبت کو دور کیا جنھوں نے تباہی پھیلا رکھی تھی۔ ان سب کتبوں سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ محمود کے بعد ہندوستان میں مسلمان باقی رہ گئے تھے اور جگہ جگہ آباد تھے اور انھیں لوگوں میں سپہ سالار مسعود غازی بھی تھے اور سپہ سالار موصوف کے بعد بھی ایک عرصہ تک مسلمان ہندوستان میں رہے۔ ان کتبوں سے اس بحث پر روشنی پڑے گی کہ محمود کے بعد سپہ سالار موصوف ہندوستان میں کیسے رہ گئے یا سپہ سالار موصوف کی شہادت کے بعد ان اطراف میں مسلمانوں کا وجود تھا یا نہیں۔ اور اس زمانہ میں کون کون مقامات ہندو راجاؤں کے راج میں تھے۔

مقامی روایتیں

اب کتبہ جات کے بعد چوتھا اور آخری ذریعہ ہمارے پاس مضمون ہذا کے واسطے مواد حاصل کرنے کا مقامی روایتیں ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اس ذریعہ کا درجہ سب سے آخری ہی اور اُس کی قیمت اور وقعت بہت زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی روایتوں میں رطب و یابس سب ہی کچھ ہوتا ہی مگر وہ بالکل خارج نہیں کی جا سکتیں۔ تاریخ آخر ہی کیا؟ روایتوں کا مجموعہ۔ فرق صرف اتنا ہی

کہ اگر روایتیں خلاف عقل نہ ہوں، دیگر ذرائع سے اُن کی تائید ہوتی ہو، وہ اگر اُس زمانہ کی ہوں جس کا تعلق واقعۂ مخصوص سے ہے یا اُس زمانہ کے قرب کی ہوں، اگر راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوں تو روایت یقیناً صحیح مان لی جائے گی ورنہ رد کرنے کے قابل قرار پائے گی۔ انھیں اصول اور شرائط پر مسلمانوں میں حدیث نبوی صلعم کو جانچنے کے لئے علم کی ایک اچھی خاصی شاخ علم اسماء الرجال کے نام سے پیدا ہوئی جس کی مدد سے ہم صحیح اور غیر صحیح حدیثوں کو جانچتے ہیں۔ اس لئے ہم سپہ سالار مسعود غازی کے متعلق مقامی روایتوں کو تاریخ سے ایک دم خارج کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں البتہ اُن کو جانچنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں ان روایتوں کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ آخر مسلمانوں کو اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ ایک ہی زمانہ میں ہندوستان بھر کے مختلف اور دور دراز مقامات پر جب کہ وسائل آمد و رفت و کلام و پیغام محدود تھے سپہ سالار موصوف کے متعلق ایک ہی قسم کی روایتیں گھڑ لی جائیں یا ہندوستان بھر کے ڈفالیوں اور بھاٹوں میں فراشن قسم کا کوئی سمجھوتا تھا کہ سپہ سالار موصوف کے متعلق ایک ہی قسم کے قصے اور افسانے مشہور کر دیتے۔ ہم کو افسوس ہے کہ انھیں روایتوں کے سلسلے میں بعض ناسمجھ ڈفالیوں نے ایسے قصے گھڑ کر سپہ سالار موصوف کی بابت گیت بنائے کہ جن سے برادرانِ وطن کے جذبات کو ٹھیس لگے مگر ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ ان میں سے بعض روایتیں جاہلوں نے بنالیں۔ کوئی سمجھدار آدمی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اُن پر یقین نہ کرے گا اور نہ اُن کا بُرا مانے گا۔ منتظمین درگاہ سپہ سالار موصوف کا فرض ہے کہ وہ ڈفالیوں کو ان حرکات سے روکیں۔ انھیں اصول کے ماتحت موقع مناسب پر ان مقامی روایتوں کا ذکر آئے گا۔ اور صحیح اور غلط روایتوں میں فرق دکھایا جائے گا۔

اس قدر لمبی چوڑی مگر از حد ضروری بحث کے بعد ہم نفس مضمون کی طرف

آتے ہیں اور پبلک کے سامنے سپہ سالار موصوف کی اُن سوانح عمری کو پیش کرتے ہیں جن کا پتا ہم کو لگ سکا۔ اپنی ناچیز رائے سے اتفاق یا اختلاف ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔

سنین ہجری و عیسوی کی تطبیق

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم نے اس کتاب میں ہجری اور عیسوی اور بکرمی سنین کی تطبیق زیادہ تر کاؤس جی سہراب جی پٹیل کے سالنامہ (کیلنڈر) مطبوعہ لندن (امپریل لائبریری کلکتہ) کے حساب سے کی ہے۔ ممکن ہے کہ حساب لگانے میں دو چار یوم کا فرق پڑے، مگر جہاں تک ہمارا خیال ہے سنین صحیح ہیں۔

باب دوم

حسب و نسب

نفس مضمون کے متعلق قدرتی طور پر سب سے پہلا سوال یہ ہو گا کہ:
سپہ سالار موصوف کا حسب و نسب کیا تھا؟

شجرۂ خاندانی کے متعلق سب سے پہلی کتاب جس نے تفصیل بیان کی مرآت مسعودی ہے اور افسوس کے ساتھ ہم کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شجرہ کے متعلق اُس کی تائید ہم کو دیگر کتب انساب سے نہیں مل سکی۔ اگرچہ خاندان کے متعلق بعض دیگر تواریخ نے روشنی ڈالی ہے۔

مرآۃ مسعودی نے جو شجرہ لکھا ہے وہ یہ ہے:-

سالار مسعود غازی[۱]۔ بن سالار شاہو غازی[۲] بن عطاء اللہ[۳] بن طاہر[۴]، بن طیب[۵] بن محمد[۶]۔ بن عمر[۷]، بن ملک[۸] بن آصف[۹]۔ بن بطل[۱۰]۔ بن عبدالمنان[۱۱] بن محمد[۱۲] ابن الحنفیہ بن حضرت اسد اللہ الغالب[۱۳] علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

اس شجرہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ سپہ سالار موصوف علوی تھے

اور دوسرے یہ کہ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تیرھویں پشت میں تھے۔ حضرت محمد ابن حنفیہ کا انتقال بقول کتاب المشرع الروی فی مناقب السادات الکرام آل ابی علوی مصنفہ علامہ محمد بن ابی بکر الشبلی باعلوی (مطبوعہ مطبع عامرہ مصر صفحہ ۸۳) کے ۸۰ھ/۶۹۹ء یا ۸۱ھ/۷۰۰ء میں اور بقول دیگر ۸۳ھ/۷۰۲ء میں ہوا۔ اس حساب سے سپہ سالار مسعود غازی حضرت محمد ابن حنفیہ کے وصال کے سوا تین سو سال بعد عالم وجود میں آئے۔ درمیانی پشتوں کا اوسط زمانہ تیس سال کے قریب ہوا۔ جو علم الانساب کی رو سے کچھ زیادہ نہیں ہے اس شجرہ کے جانچنے میں ہم کو پیرزادہ محمد حسین دہلوی مترجم ابن بطوطہ کی اس رائے سے کہ حضرت محمد ابن حنفیہ کے کسی صاحبزادہ عبدالمنان کا پتا نہیں چلتا، افسوس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ پیرزادہ صاحب موصوف اپنی سند میں ابن قتیبہ کی مشہور کتاب معارف کو پیش کرتے ہیں علاوہ المشرع الروی کے کتب ذیل رامپور کے کتب خانہ میں دیکھی گئیں یعنی

کتب انساب

عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب المعروف بہ عمدۃ المطالب (مطبوعہ بمبئی) سلک الذہب فی معرفۃ قبائل العرب لب الالباب فی تحریر الانساب کتاب الانساب نہایت العرب فی معرفت قبائل العرب۔ اور بدایوں میں مولانا یعقوب بخش صاحب راغب کے پاس مشہور تصنیف علامۂ حجر عسقلانی کی یعنی تہذیب التہذیب دیکھی گئی ان سب میں عبدالمنان نام ہم کو نہیں ملا۔

حضرت محمد ابن حنفیہ کی اولادیں

حضرت محمدؓ ابن حنفیہ کی ۲۴ اولادیں تھیں جن میں سے ۱۴ اور بقول دیگر ۱۸ صاحبزادے تھے جو نام ان حضرات کے معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں: ابوہاشم[۱] عبداللہ الاکبر[۲]، عبداللہ الاصغر[۱] حمزہ[۳]۔ علی[۴]۔ جعفر الاکبر[۵]۔ جعفر الاصغر[۶]۔ عون[۷]۔ قاسم[۸]۔ ابراہیم[۹]۔ الحیشم[۱۰]۔ عمر[۱۱]۔ حسن[۱۲]۔ باقی ناموں کا پتا نہیں لگ سکا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان باقی ناموں میں حضرت عبدالمنان کا بھی نام ہو۔ مگر یہ بات قیاس میں نہیں آتی۔ کیوں کہ ان اسناد

مندرجہ بالا کی رو سے حضرت محمد ابن حنفیہ کی اولاد صرف دو صاحبزادوں اور بقول دیگرے
تین صاحبزادوں سے یعنی علی اور جعفر الاکبر اور ابو ہاشم عبداللہ الاکبر سے ۔ جن کو
امام الکیسانیہ بھی کہتے تھے چلی ۔ ان اسناد نے حضرت محمد ابن حنفیہ کے بقیہ صاحبزادوں
کو مقطوع النسل قرار دیا ہے ۔

نو سو برس کی بات اس گتھی کا سلجھانا کوئی آسان کام تو ہے نہیں ۔ یقینی طور پر یہ بھی
نہیں کہا جا سکتا کہ مرآۃ مسعودی کا شجرہ غلط ہے اور سپہ سالار مسعود غازی علوی نہ تھے
حضرت محمد ابن حنفیہ کی نسل بقول اکثر نسابین کے جیسا کہ عمدۃ الطالب نے لکھا ہے ، عبداللہ
راس المذری بن جعفر الثانی بن عبداللہ بن جعفر بن محمد ابن حنفیہ تک پہونچتی ہے ۔ عبداللہ
راس المذری کے ۹ نو بیٹے تھے جن میں صرف دو کے نام معلوم ہوئے یعنی علی بن راس المذری
اور جعفر الثالث بن راس المذری ۔ جب تاریخی مصالحہ کا اس قدر فقدان ہو تو کوئی
کیسے کہہ سکتا ہے کہ فلاں بزرگ کا شجرہ یقینی اور فلاں کا مشکوک ہے ۔ جعفر الثالث کے
چار بیٹے تھے یعنی زید ، عسل ، موسیٰ ، عبداللہ اور بعض نے ایک نام ابراہیم
بھی بتایا ہے ۔ اس لئے کیا خبر کہ مرآۃ مسعودی کے شجرہ میں عسل کی خرابی بطل ہو ۔

مرآۃ مسعودی کے بعد کی کتابیں اور شجرہ سپہ سالار مسعود غازی کی بحث

مرآۃ مسعودی کے علاوہ بعد کی کتابوں نے بھی سپہ سالار
مسعود غازی کے شجرہ پر بحث کی ہے ۔ مولانا شاہ
ضیاء الدین نقشبندی امروہوی ۔ اپنی کتاب
مرآۃ الانساب میں یہ شجرہ یوں لکھتے ہیں سالار
مسعود غازی بن سالار شاہو غازی ۔ بن عطاء اللہ بن طاہر ، بن بطل ، بن عبدالمنان
بن سیف ۔ بن ہاشم بن محمد ابن الحنفیہ ۔ مولانا موصوف نے اس شجرہ کی تائید میں
کسی سند کا حوالہ نہیں دیا ۔ بجز اس کے کہ اُن کے ایک دوست کو قسطنطنیہ میں پُرانے
شجروں کے مجموعہ کا ایک نسخہ ملا جس سے کتاب مرآۃ الانساب مرتب کی گئی ۔ اس شجرہ میں

بھی ابو ہاشم کے کسی صاحبزادے سیف کا پتا نہیں چلتا۔ اسماء الرجال میں علامہ ابن حجر عسقلانی نے جلد ۶ صفحہ ۱۶ پر ابو ہاشم کے ایک صاحبزادہ عیسیٰ کا نام ضرور درج کیا ہے۔ اگرچہ بقول دیگر نساببین ابو ہاشم عبداللہ جن سے بیعت بنو عباس کی طرف منتقل ہوئی۔ مقطوع النسل تھے۔ مولوی عبداللہ خاں علوی مصنف تاریخ گلزار مانک پور صفحہ ۶۱ پر لکھتے ہیں کہ حضرت جعفر الاکبر ابن محمد بن حنفیہ کو عبدالمنان بھی کہتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مرآۃ مسعودی کا شجرہ ایک حد تک صحیح قرار پاتا ہے۔ مگر مورخ مذکور نے اپنے روایت کی صحت کے متعلق کوئی سند نہیں دی اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُن کا شجرہ صحیح ہے یا محض اس دقت کو رفع کرنے کے لئے گھڑ لیا گیا بقول عمدۃ الطالب کے حضرت محمد ابن حنفیہ کی کچھ اولاد عجم میں آباد ہوئی۔ ہمارے نقطۂ خیال سے یہ بیان ایک اہم بیان ہے کیوں کہ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ محمودی دربار کے علوی بھی عجم سے آئے تھے ہم اس بحث کو یہاں ترک کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے کتنے صاحبزادہ تھے اور اُن کے نام کیا کیا تھے۔

حضرت محمد ابن حنفیہ صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ حضرت محمد ابن الحنفیہ کی اولاد علوی کہلائی۔ بقول المشرع الروی کے حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں نویں پشت میں ایک صاحبزادے علوی نام کے تھے جن کی اولاد میں ہندوستان کے بہت سے علوی بتائے جاتے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت محمد ابن حنفیہ جو بقول مرآۃ مسعودی کے سپہ سالار مسعود غازی کے مورث ہیں۔ بڑے عالم فاضل شجاع، عابد اور فصیح تھے۔ بقول علامہ ابن حجر عسقلانی و مشرع الروی کے حضرت محمد ابن حنفیہ جنگ جمل میں اپنے والد ماجد کے علمبردار تھے۔ واقعۂ کربلا میں بھی شریک تھے اور حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شہادت کے بعد شیعان علی کے سردار تھے۔ بقول مشرع الروی اور

علامہ حجر عسقلانی کے شیعان علی کا خیال ہے کہ حضرت محمد ابن الحنفیہ مہدی آخر الزماں ہونگے۔
مگر جب اس گروہ کے لوگ اُن کو السلام علیک یا مہدی کہکر پکارتے تھے وہ جواب
دیتے تھے کہ میں اس لحاظ سے مہدی ہوں کہ لوگوں کو ہدایت کرتا ہوں تم مجھکو
یا محمد کہو (صفحہ ۸۶۔ علامہ ابن حجر بر بنائے بخاری) حکیم سید جلیل قریشی اپنی کتاب
داب حیدری کے صفحہ ۸۳ پر لکھتے ہیں کہ وصال کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ محمد ابن حنفیہ کا خیال رکھیں۔

سپہ سالار مسعود غازی افغانی النسل تھے

سپہ سالار موصوف کے شجرہ کے سلسلہ میں ایک بڑی
دلچسپ اور نئی تاریخی روایت ہم کو معلوم ہوئی جو
مراۃ مسعودی کے شجرہ کو غلط اور سپہ سالار مسعود غازی
کو افغانی النسل قرار دیتی ہے۔ خواجہ نعمت اللہ کی تاریخ مخزن افغانی
کے مترجم مسٹر ڈورن نے انگریزی ترجمہ کے صفحہ ۷۹ پر بہ سلسلہ خاندان غزنوی ایک نوٹ
دیا ہے۔ اُس میں نواب محبت خاں پسر حافظ الملک حافظ رحمت خاں روہیلہ والی بریلی کی
کتاب ریاض المحبت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب سبکتگیں کے انتقال کے بعد محمود غزنوی
سے اور اُس کے بھائی اسمٰعیل سے تخت نشینی کے قضیہ میں لڑائی ہوئی تو محمود کی
فوج میں بہت سے افغان تھے اور اُن کے سرداروں نے بڑی بہادری دکھائی یہاں تک
کہ محمود کو اپنے بھائی پر فتح حاصل ہوئی تو محمود نے خوش ہو کر اپنے ایک بہن کی
شادی افغانی سردار شاہو سے کردی اور اُن سے سپہ سالار مسعود غازی پیدا ہوئے۔

ریاض المحبت

کتاب ریاض المحبت جو اب نایاب ہے ہم کو دیکھنے کو نہ مل سکی اور
ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہی کتاب ہے جس کا نام اخبار المحبت ہے
اور جس کو نواب محبت خاں نے ۱۸۰۶ء میں تصنیف کیا اور جس کا حوالہ سر ہنری ایلیٹ نے
اپنی تاریخ کے جلد ہشتم صفحہ ۳۷۶ لغایۃ ۳۹۳ پر دیا ہے یا کوئی اور کتاب

ڈورن ڈورن نے لکھا ہے کہ اس کی ایک جلد اُن کو نواب محبت خان کے بیٹے علی اکبر خاں سے ملی اور وہ پشتو زبان میں تھی۔ مصنف حیات حافظ رحمت خاں نے بھی لکھا ہے کہ نواب محبت خاں جن کا انتقال لکھنؤ میں ۱۸۰۹ء میں ہوا عربی فارسی اور پشتو کے عالم تھے۔ سرہنری ایلیٹ بھی ایک دوسری تاریخ ریاض المحبت کا حوالہ اُس انڈکس میں صفحہ ۴۴ پر دیتے ہیں جو اُنھوں نے بڑی محنت سے مورخانِ ہند کی بابت مرتب کی اور جو گورنمنٹ کی منشا سے ۱۸۴۹ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی نایاب ہے اور ہم کو دیکھنے کو نہ مل سکی۔ غالباً یہ اخبار المحبت سے جدا گانہ ہے۔ بہرحال یہ مسلمہ ہے کہ محمود کی فوج میں افغان تھے۔

مخزن افغانی نے ان پٹھان سرداروں کے نام دیئے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ ۴۰۸ھ میں جب کہ تسلط کے بعد محمود غزنوی نے بہت سے ملک فتح کر لئے تھے افغان سردار اُس کے سلام کو حاضر ہوئے اور اُس کے دربار میں اُنھوں نے ملازمت حاصل کی ان میں ملک کالو۔ ملک عامون، ملک داؤد، ملک یحییٰ، ملک احمد، ملک محمود، ملک عارف، ملک غازی اور محمود نے مختلف طریقوں سے اُن کے ساتھ سلوک اور اُن کی عزت افزائی کی۔ اُن کو روپیہ اور جاگیریں دیں اور اپنے ساتھ سومناتھ کی جنگ میں لے گیا اور جب سومناتھ میں فتح ہوئی تو محمود نے ان سرداروں کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور وہ سلطنت کے ارکان قرار پائے۔

ونسیی ٹارٹ ڈورن نے صفحہ ۷۸ پر ونسیی ٹارٹ کے اُس مضمون کا حوالہ دیا ہے جو ایشیاٹک رسرچیز میں شائع ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ محمود غزنوی کے دربار میں خالد بن ولید کی اولاد میں سے آٹھ آدمی آئے۔ اُن کے نام کالون، عالون، داؤد، یحییٰ، احمد، عاوین اور غازی تھے۔ سلطان اُن سے بہت خوش ہوا اور اُن کو اپنی فوجوں کا سردار بنایا۔ وزیر وکیل مطلق اور اپنا ایجنٹ

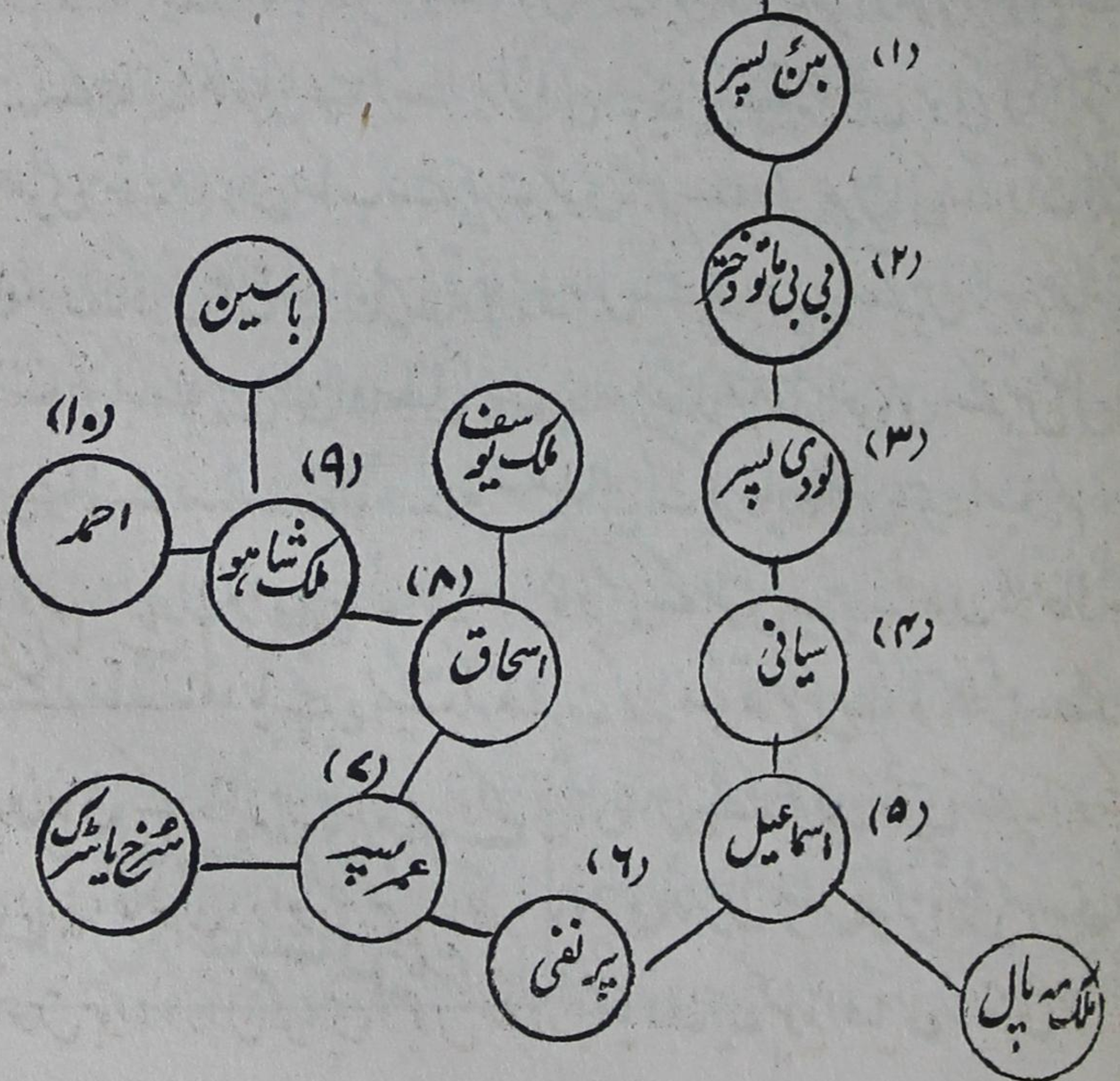
بنایا اور جہاں وہ تعینات ہوتے تھے مسجدیں بناتے تھے اور ملک فتح کرتے تھے، منادر کو توڑتے تھے اور آخر میں زیادہ تر محمود کی فوج میں افغان ہی تھے۔

تاریخ فرشتہ افغان جو محمود کے دربار میں تھے

تاریخ فرشتہ نے (ترجمہ جلد اول صفحات ۱۹ ـ ۳۱ ـ ۴۷ ـ ۴۸) یہ لکھا ہے کہ افغان سبکتگین کی فوج میں بھی تھے اور محمود کے ساتھ بھی۔ ایشیا اور ہندوستان کی مختلف لڑائیوں میں لڑے۔

افغانوں کا شجرہ اور اس میں سالار شاہو کا نام

ڈورن نے مخزن افاغنہ کے حصہ دوم صفحہ ۱۵ پر پٹھانوں کی ایک شاخ کا شجرہ اس طریقہ سے دیا ہے:



اس شجرہ میں ایک ملک شاہو ضرور آتے ہیں جو لودیوں کی نسل سے ہیں مگر ملک شاہو کے دو بیٹے ہیں جن میں سپہ سالار مسعود غازی کا نام نہیں ہے۔ علاوہ اس کے مورخین نے قیس عبدالرشید کو حضرت رسول خدا محمد مصطفےٰ صلعم کا ہم عصر بتایا ہے قیس سے لے کر شاہو کی اولاد تک دس پشتیں ہوئیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ملک شاہو وہی تھے جو محمود غزنوی کے ہم عصر تھے اور سپہ سالار مسعود غازی کے والد بزرگوار اور جن کو مخزن افاغنہ ومینسی ٹارٹ اور ڈورن نے ملک غازی کے نام سے پکارا ہے یا کوئی دوسرے صاحب اس بارے میں ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے اور نہ یقینی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ وہی بزرگ تھے تو اُن کی صرف دو اولادیں تھیں جن میں سپہ سالار مسعود غازی کا نام نہیں ہے۔ بہرحال اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس شجرہ کے ملک شاہو سپہ سالار مسعود غازی کے والد بزرگوار تھے تو ہم اُن کے زمانہ کو جانچنے کے لئے ایک معیار قائم کرسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک غازی اور دیگر افغان سردار محمود غزنوی کے ساتھ اُس کے بھائی اسماعیل سے لڑے۔ یہ لڑائی ربیع ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء میں ہوئی (ڈاکٹر ناظم صدیقی صفحہ ۴۰) اس حساب سے ہجرت نبوی صلعم سے اگر ہم لڑائی کے وقت ملک شاہو کی عمر بیس پچیس سال کی مان لیں تو چار سو سال سے کچھ اوپر ہوتے ہیں قیس عبدالرشید سے شاہو تک چالیس سال اوسط فی پشت ہوا۔ بمقابلہ مرآۃ مسعودی کے تیس سال کے اُس زمانہ کے اور ملک کے لحاظ سے چالیس سال تک کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اب ہم ان دونوں روایتوں کو یعنی سپہ سالار مسعود غازی کے علوی سید ہونے اور یا افغانی النسل ہونے کو ساتھ ساتھ جانچیں گے تاکہ ناظرین کو رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

مسلمانوں میں شادی بیاہ کے سلسلہ میں ذات پات کی قید نہ تھی

قبل اس کے کہ ہم ان دلچسپ امور پر روشنی ڈالیں یہاں یہ گزارش ضروری ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور اُس زمانہ میں خصوصاً شادی

بیاہ میں ذات پات کے قصے" آج کل کی طرح سے نہ تھے اور اسلامی ممالک میں اب بھی نہیں ہیں۔ اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ترکوں کا یعنی محمود غزنوی کا اور افغانوں یا سیدوں کا رشتہ کیسا! ممالک اسلام میں محض پیشہ یا تمدنی معاشرتی اور دولت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے درجہ میں فرق ضرور ہوتا ہے مگر اس فرق پر شیخ، سید، افغان مغل ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہندوستان میں اگر مسلمانوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی یہ تنگ نظری اختیار کی جس سے اُن کا شیرازہ ٹوٹ گیا۔ اُس زمانہ میں مسلمان بادشاہ اور اُمرا اپنی لڑکی اکثر سیدوں کو اُن کی تکریم اور توقیر کے لحاظ سے یا دیگر اشخاص کو اُن کی نمایاں کارگزاری کے لحاظ سے ضرور دیتے تھے۔ اور اس کی متعدد مثالیں تواریخ میں موجود ہیں۔ بقول یمینی العتبی (صفحہ ۴۱۵ - ۴۱۶) محمود غزنوی نے اپنی بیٹی کی شادی فلک المعانی ابن شمس المعانی قابوس بن وشم گیر والی جرجان اور طبرستان کے ساتھ کی اور اپنی ایک بہن کی شادی امیر فریغون کے ساتھ پولیٹیکل وجوہ اور سیاسی پیش بندی سے کی۔ یہ لوگ ترک نہ تھے۔ اسی طریقہ سے غزنوی خاندان کے آخری بادشاہوں میں سے ایک تاجدار یعنی ابراہیم غزنوی نے اپنی کئی ایک بہنوں کی شادیاں سیدوں کے ساتھ کیں اور انہیں میں سے طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج السراج تھے جیسا کہ خود اس مصنف نے لکھا ہے۔ اس لئے سیدوں یا افغانوں کی محمود کے ساتھ رشتہ داری کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے اور ہم ریاض المحبت کی روایت کو محض یہ کہکر نہیں ٹھکرا سکتے کہ سپہ سالار مسعود غازی سید مشہور ہیں اور محمود غزنوی ترک تھا۔

محمود کے دربار میں علوی خاندان

اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ جس طریقہ سے افغان محمود کی فوج میں تھے علوی خاندانوں کا بھی محمود سے کچھ تعلق تھا یا نہیں۔ جن اوراق پریشان کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے اور جو ہم کو بہرائچ میں

مزار سپہ سالار موصوف کے متوسلین میں سے ایک صاحب کے پاس دیکھنے کو ملے اُن سے
معلوم ہوا کہ سپہ سالار شاہو شہر ہمدان ملک عراق عجم کے رہنے والے تھے۔ اور
حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد مع اپنے عزیز سالار سیف الدین کے محمود غزنوی
کی فوج میں ملازم ہوئے اور ایشیائی جنگوں میں محمود کے ساتھ شریک رہے۔ یہ
روایت نہ تو مرآۃ مسعودی میں ہے اور نہ کہیں اور سے اُس کی تائید ہوتی ہے
اس لئے اُس کی صحت میں ہم کو بہت شبہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شہر ہمدان اور رے
میں جو کہ صوبۂ دیلم کے شہر تھے۔ علوی بہت سے آباد تھے۔ جیسا کہ ابن خلدون نے
لکھا ہے (ترجمہ مولوی محمد حسین الہ آبادی) بیہقی سے اور عمدۃ الطالب سے بھی
اس کی تائید ہوتی ہے (عمدۃ الطالب مطبوعہ بمبئی صفحہ ۳۲۱) بقول بیہقی (صفحہ ۳۵۲
مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) محمود کے زمانہ میں غزنین میں بہت سے علوی شرفا
آگئے تھے۔ ممکن ہے کہ غزنین میں علوی شرفا کی موجودگی سے بیہقی کا اشارہ سپہ سالار
شاہو کے خاندان سے ہو۔ یہاں ہم کو ایک بڑی دلچسپ بات عرض کرنا ضروری ہے۔

لفظ سالار کی تشریح

بقول عتبی (ترجمہ انگریزی صفحات ۳۰۲ - ۳۰۶) کے
صوبۂ دیلم کے رہنے والے سرداروں کے ساتھ لفظ سالار
عام طور سے لگا ہوتا تھا اور نام بھی عجیب عجیب طرح کے ہوتے تھے مثلاً: فرقاش سالار
اشفو سالار، حیدر بن سالار۔ اور ایک دیلمی سردار مرزبان بن احمد الملقب بہ
"سالار" تھے جن سے محمود غزنوی سے لڑائی ہوئی۔ بقول المسعودی کی کتاب
مروج الذہب (ترجمہ انگریزی امپریل لائبریری کلکتہ) کے صوبۂ دیلم کا ایک قلعہ
قلعۂ سالار کے نام سے مشہور تھا۔ اس لئے اگر سپہ سالار مسعود غازی واقعی علوی تھے
تو ممکن ہے کہ اُن کے خاندان کے ساتھ لفظ سالار خاندانی لحاظ سے استعمال ہوتا ہو
عتبی (ترجمہ انگریزی صفحہ ۳۹۰ - ۴۱۵) سے بخوبی ثابت ہے کہ دیلم کے رہنے والے

اور اُن کے سردار محمود غزنوی کی فوج میں ملازم تھے اور دیلمی سردار فلک المعالی بن شمس المعالی قابوس بن وشم گیر نے محمود کی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد چیدہ چیدہ دیلمی سردار محمود غزنوی کی خدمت کے لئے بھیجے۔ بحر کاسپین کا جنوبی حصہ جو اُس زمانہ کا صوبۂ دیلم تھا علویوں سے بھرا پڑا تھا۔

سالار شاہو سے ملتے جلتے نام

تاریخ میں ہم کو دو نام اور ایسے ملتے ہیں جو شاہو سے ملتے جلتے ہیں یعنی سارُغ جو بقول بیہقی (صفحہ ۱۶۹-۱۷۰) کے قلعہ نندنہ پنجاب کا کوتوال تھا اور دوسرا سلجوق یا راجوق آخرالذکر بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی (صفحہ ۷۵) کے اور گردیزی کے محمود کے زمانہ میں ایک افسر تھا جس کو محمود نے وادی نور کی فتح کے بعد اُس ملک کا گورنر مقرر کیا۔ فرشتہ نے اس کو علی بن قدر سلجوق لکھا ہی مگر یہ سردار یقیناً سالار شاہو سے جداگانہ معلوم ہوتا ہی اور غالباً وہی ہی جس کو مرآۃ مسعودی نے ملک چھجو لکھا ہی اور جس کی جگہ سالار شاہو کا تبادلہ محمود غزنوی نے کیا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ چھجو، راجوق یا سلجوق کی خرابی معلوم ہوتی ہی۔ سارُغ ترکی نام معلوم ہوتا ہی۔

سید اور علوی کی تفریق

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اُس زمانہ میں علوی سید کے لقب سے پکارے جاتے تھے یا نہیں؟ عرب میں سید کا لفظ حسنی حسینی اور فاطمی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مگر عرب سے باہر یہ تفریق نہ تھی کتاب المشرع الروی نے صفحہ ۲۰ پر علامہ سیوطی کے حوالہ سے لکھا ہی کہ سید کا لفظ صرف حسنی اور حسینی اشراف کے لئے استعمال ہوتا تھا مگر معلوم ہوتا ہی محمود غزنوی کے زمانہ میں یہ تفریق نہ رہی کیوں کہ بقول بیہقی (صفحہ ۱۶-۱۷) کے عبدالعزیز علوی جو محمود کے انتقال کے وقت مشہور علویوں میں سے تھے اور جس کو محمود کے بیٹے مسعود غزنوی نے اپنے بھائی محمد کے پاس قاصد بنا کر بھیجا، سید کے لقب سے پکارے جاتے

تھے۔ اسی طریقہ سے العتبی نے (صفحہ ۲۲۵ انگریزی پر) ابوالحسن ہمدانی علوی کا جن کو امیر ابوالحارث نے ایلچی بنا کر محمود کے پاس بھیجا، سید کے لقب سے ذکر کیا ہے۔

سپہ سالار موصوف کے نام کے ساتھ سید کا لفظ کب استعمال ہوا

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کا سب سے پہلے سید کے لقب سے کس تاریخ نے اور کس زمانہ میں تذکرہ کیا سب سے پہلی تاریخیں جن میں ہم کو سپہ سالار موصوف کا ذکر ملتا ہے فیروز شاہی عہد کی تاریخیں فیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی و فیروز شاہی مصنفہ شمس سراج عفیف ہیں۔ ان کے بعد اکبری عہد کی تاریخیں جو مرآۃ مسعودی کے تصنیف سے قبل کی ہیں اور جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے ان تاریخوں میں سپہ سالار مسعود غازی کے نام کے ساتھ لفظ سید استعمال نہیں ہوا۔ صرف سپہ سالار کے خطاب سے پکارا گیا ہے۔ سب سے اول مرآۃ مسعودی نے سید الشہدا کے لقب سے تذکرہ کیا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے جس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ تاریخ ریاض المحبت کا یہ بیان کہ سپہ سالار موصوف افغانی النسل تھے صحیح ہو۔ اس قدر مصالحہ بہم پہونچانے کے بعد اس امر کا فیصلہ ہم ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ بہر حال اس واقعہ سے اُن کے شہید ہونے یا محمود غزنوی کے قریبی رشتہ دار ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا جس کی تفصیلیں آگے آئیں گی۔

سپہ سالار موصوف کی والدہ

اب یہاں بڑا دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کی والدہ ماجدہ کون تھیں۔ مرآۃ مسعودی نے اُن کی والدہ کا نام بی بی ستر معلیٰ لکھا ہے اور اُن کو محمود کی ہمشیرہ بتایا ہے۔ یہ نام بجز مرآۃ مسعودی کے ہم کو کسی اور تاریخ میں نہیں ملا۔ یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ محمود غزنوی کی کتنی بہنیں تھیں، اُن کے کیا کیا نام تھے؟ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ان تفصیلوں کی بابت جو تاریخی خیال سے کم از کم اُس زمانہ کے لئے

بہت اہم ہیں اور آج اُن کی اہمیت کہیں زیادہ ہوگئی ہے، اس میں مصالحہ بہت کم ہے۔

محمود کی بہنیں

بیہقی، گردیزی اور عبدالقادر بدایونی کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کی ایک بہن کا نام بی بی کالجی تھا جن کی شادی پولیٹکل اتحاد کی خاطر ابو العباس ابن مامون خوارزم شاہ کے ساتھ ہوئی ابن خلدون (ترجمہ اُردو جلد ۱۳ صفحہ ۲۳۰) نے لکھا ہے کہ محمود کی ایک بہن کی شادی ابو نصر بن ابو الحرث احمد بن محمد سے ہوئی جو خاندان بنی فریغون سے تھا۔ یہ وہی ہے جس کو بیہقی نے امیر گوزگانان فریقون لکھا ہے۔ بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی کے جن کی روایت العتبی پر مبنی ہے، ابو نصر محمد کئی ایک حملوں میں محمود کے ساتھ ہندوستان آیا۔ مگر یہ ابو نصر محمد اور سالار شاہو ایک اس وجہ سے نہیں ہوسکتے کہ ابو نصر محمد کا انتقال ۴۰۱ھ میں ہوگیا تھا اور بقول بیہقی ابو نصر محمد کے بیٹے کا نام حسن تھا نہ کہ مسعود۔ محمود کی دو بہنیں تو یوں نکل گئیں۔

حرہ ختلی

بیہقی (صفحہ ۱۲-۱۳۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کی ایک بہن یا بالفاظِ دیگر مسعود غزنوی کی ایک پھوپی تھیں جن کا نام حُرہ ختلی تھا۔ جیسا کہ بیہقی نے لکھا ہے ان کے تعلقات محمود کے جانشین مسعود غزنوی سے اچھے نہ تھے۔ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو ستر معلّیٰ حُرہ ختلی کی خرابی ہے اور ممکن ہے کہ اسی باہمی تعلقات کی کشیدگی کی وجہ سے محمود کے بعد سپہ سالار مسعود نے غزنین کا رخ نہ کیا اور ہندوستان میں خود مختاری کے ساتھ غزوات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شہید ہوگئے یہاں صرف ایک دقّت پیش آتی ہے۔ بقول مراۃ مسعودی کے بی بی ستر معلّیٰ محمود غزنوی کے انتقال کے وقت ہندوستان میں سالار شاہو کے ساتھ موجود تھیں اور سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت سے قبل غزنین کے ناہر کا لہیر مقام میں اپنے خاوند کے یہاں

انتقال کر گئی تھیں مگر بقول بیہقی (صفحہ ۱۲) حرۂ ختلی محمود کے انتقال کے وقت غزنیں میں موجود تھیں اور انھیں نے مسعود غزنوی کے پاس محمود کے انتقال کی خبر بھیجی۔ بقول بیہقی کے وہ ۴۲۸ھ ۱۰۳۶ء تک زندہ رہیں۔ اگر بیہقی کا بیان صحیح ہے تو ستر معلّیٰ اور حرۂ ختلی دونوں ایک ہی نہیں ہو سکتیں۔ ممکن ہے کہ یہاں مرآۃ مسعودی کے ماخذ مُلّا محمد غزنوی نے کچھ غلطی کی ہو۔

محمود کی دوسری رشتہ کی بہنیں

بقول تاریخ گزیدہ مصنفہ حمد اللہ مستوفی (فارسی صفحہ ۱۶۶) کے محمود غزنوی کی ایک سوتیلی ماں بھی تھیں محمود غزنوی کے دو چچا تھے جن میں سے ایک کا نام بغراجق تھا۔ ممکن ہے کہ ستر معلّیٰ محمود کی چچا زاد بہن ہوں یا اُن کے سوتیلی ماں کی بیٹی ہوں۔

محمود اور سپہ سالار موصوف کی رشتہ داری

بہر حال محمود غزنوی اور سپہ سالار مسعود غازی کی رشتہ داری مرآۃ مسعودی سے پیشتر کے مورخین سے بھی ثابت ہے۔ یہ سچ ہے کہ سب سے پہلی کتابوں نے یعنی فیروز شاہ تغلق کے عہد کی تواریخ فیروز شاہی نے اس رشتہ داری کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور صرف اس قدر لکھا کہ سپہ سالار مسعود غازی، محمود کے غازیوں میں سے تھے (فیروز شاہی ضیاء الدین برنی، صفحہ ۳۹۱ فیروز شاہی شمس سراج عفیف صفحہ ۳۷۲) مگر اُسی کے ساتھ مولانا نظام الدین کی تاریخ طبقات اکبری نے جو نہایت مستند اور غیر جانبدار تاریخ سمجھی جاتی ہے لکھا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی "یکے از قرابت سلطان محمود بود" یعنی سپہ سالار موصوف محمود غزنوی کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ اس تاریخ کے چند سال بعد ہی تاریخ فرشتہ نے لکھا کہ "سپہ سالار مسعود خویشاوند سلطان محمود بود" یعنی سپہ سالار محمود کے رشتہ داروں میں تھے (فرشتہ ترجمہ انگریزی جلد اول صفحہ ۴۳۱) ان دونوں مورخین کے زمانہ میں مرآۃ مسعودی کا وجود بھی نہ تھا اور

ایک امر پر دونوں کو اتفاق اور دونوں مستند۔ دونوں کے سامنے اس قدر تاریخی مصالحہ ہوگا جس کا آج وجود بھی نہیں ہے۔ تو ہم کیسے مان لیں کہ مرآۃ مسعودی کی روایت یقین کے قابل نہیں ہے اور سپہ سالار موصوف محمود کے رشتہ دار نہ تھے۔ اسی سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً ریاض المحبت کی یہ روایت صحیح ہے کہ محمود نے اپنی بہن کی شادی سپہ سالار شاہو سے کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ حقیقی بہن ہوں یا رشتہ کی۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ اگر سپہ سالار شاہو اور اُن کے صاحبزادے سپہ سالار مسعود غازی شاہی مقربین میں سے نہ ہوتے تو ہندوستان جیسے دور دراز ملک میں آکر فوج بھرتی کرنے اور غزوات کرنے کی اُن کو جرأت بھی نہ ہوتی۔

محمود کے بڑے بڑے جنرل

یہ دوسری بات ہے کہ وہ کوئی اتنے بڑے جنرل یا عہدہ دار نہ ہوں جیسے کہ محمودی جنرل اریارق سالار، ارسلان جاذب، التونتاش، ابو عبداللہ الطائی، علی خویشاوند وغیرہ تھے۔ جن کے اذکار ہم کو لڑائیوں کے سلسلہ میں تواریخ میں ملتے ہیں۔ محمودی افسران کی تعداد تو صدہا تک پہونچتی ہے اور اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں کہ جن کے ناموں تک کا پتا نہیں ہے حالات تو کجا۔

سپہ سالار مسعود غازی کب اور کہاں پیدا ہوئے

اب ہم اس بحث پر آتے ہیں کہ سپہ سالار مسعود غازی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ تاریخی لحاظ سے یہ بڑی دلچسپ بحث ہے۔ مگر ہم کو اس مشکل مسئلہ کے حل کرنے میں قدرے آسانی اس وجہ سے ہوجاتی ہے کہ آج سے چھ سو برس کی تاریخوں سے مرآۃ مسعودی کی اندرونی شہادت سے اور دیگر ذرائع سے سپہ سالار مسعود غازی محمود غزنوی کے ہم عصر قرار پاتے ہیں۔ اور محمود غزنوی کا زمانہ مستند طور پر اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے۔ محمود غزنوی ۳۸۹ھ مطابق ۹۹۸ء میں تخت پر بیٹھا اور ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء تک

اُس نے حکومت کی۔ مرآۃ مسعودی نے سپہ سالار مسعود غازی کی پیدائش کی تاریخ ۲۱ شعبان یا رجب سنہ ۴۰۵ھ مطابق ۱۵ فروری سنہ ۱۰۱۵ء لکھی ہے۔ پیدائش سپہ سالار موصوف کی یہ تاریخ اور سال بجز مرآۃ مسعودی کے اُس سے قبل کی کسی اور تاریخ میں نہیں ملتے۔ البتہ تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کا زمانہ سنہ ۵۵۷ھ میں تھا۔ یہ سال بالکل خلاف قیاس و عقل ہے یہاں فرشتہ نے بلاشبہ غلطی کی جیسا کہ سنین کے بارے میں اُس نے کئی ایک اور معاملوں میں بھی کی ہے۔ یہ زمانہ غزنوی خاندان کے آخری تاجداروں میں سے خسرو ملک بن خسرو شاہ کا تھا۔ اس زمانہ میں اس خاندان کو اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل تھی۔ غوریوں کے حملوں سے تنگ آکر بادشاہ غزنوی لاہور میں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ سنہ ۵۸۲ھ مطابق سنہ ۱۱۸۶ء میں ہمیشہ کے لئے غوریوں کے ہاتھوں آل سبکتگین کا خاتمہ ہو گیا۔ بھلا اس زمانہ میں غزنین سے غزوات کرنے کے لئے سپہ سالار مسعود غازی یا کوئی اور غازی کیا آتے۔ علاوہ ازیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گووند چند اور اُس کا جانشین چندر دیو گہڑوال راجگان قنوج سنہ ۱۱۱۶ء و سنہ ۱۱۷۵ء شمالی ہندوستان سے مسلمانوں کو بہت کچھ نکال چکے تھے جیسا کہ اُن کتبوں سے ثابت ہے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ ایسی حالت میں فرشتہ کا سن یعنی سنہ ۵۵۷ھ / ۱۲۰۰ء یقیناً غلط ہے۔ سنہ ۱۱۹۶ء کے آس پاس تو قطب الدین ایبک دہلی کو لے چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مرآۃ مسعودی کے سال کی تائید کسی اور ذریعہ سے ہوتی ہے یا نہیں۔ مرآۃ مسعودی نے لکھا ہے کہ سپہ سالار موصوف غازی سے لڑنے کے لئے بہرائچ میں جو راجہ جمع ہوئے اُن میں رائے گنگ اور رائے کرن بھی تھے۔ اب اگر ہم یہ بتا سکیں کہ یہ واقعی ہستیاں تھیں نہ کہ فرضی اور اُن کے زمانہ کا تعین کر سکیں تو سپہ سالار مسعود غازی کے زمانہ پر روشنی ڈالی جا سکے گی۔ رائے گنگ اور رائے کرن کوئی مقامی راجگان نہیں ہیں بلکہ گنگ دیو کالاچھری ریاست چھیدی کا راجہ تھا اور کرن دیو اُس کا بیٹا تھا۔ اگرچہ گنگ دیو کے زمانہ میں

تھوڑا بہت اختلاف ہی مگر اُس کے اور اُس کے بیٹے کے کتبوں کے ذریعے سے گنگ دیو کا زمانہ گیارہویں صدی عیسوی کے پہلی ربع سے لے کر تیسری ربع تک قرار پاتا ہی۔ بقول مورخ وِنسنٹ سمتھ کے گنگ دیو نے ۱۰۱۵ء سے ۱۰۴۰ء تک راج کیا مگر بقول کتاب اپی گریفیا انڈ کا جلد دوم صفحہ ۲۹۷ لغایۃ ۳۰۴ کے کرن دیو کی حکومت ۱۰۴۲ء سے ۱۰۸۰ء تک تھی۔ بہرحال ان دونوں کی روسے گنگ دیو اور سپہ سالار مسعود غازی کا زمانہ ایک قرار پاتا ہی۔ علاوہ ان کے بقول مورخ بیہقی (صفحہ ۴۹۶ و ۴۹۷) کے بنارس راجہ گنگ دیو کی حکومت میں شامل تھا جب کہ مسعود غزنوی کے جنرل احمد نیال تگین نے بنارس پر حملہ کیا۔ یہ حملہ ۱۰۳۳ء میں ہوا۔ گنگ دیو کا ذکر ابوریحان البیرونی نے بھی اپنی کتاب تحقیق ماللہند میں کیا ہی۔ کرن دیو کے کتبہ سے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہی ثابت ہی اور اس ثبوت کی بنا پر مورخ ویدیا نے اپنی تاریخ جلد سوم کے صفحات ۱۴۹ و ۱۸۸ پر لکھا ہی کہ گنگ دیو اور کرن دیو دونوں ترکوں سے لڑے جب وسط ہند اور قنوج کے راجگان سبکتگین اور محمود غزنوی سے لڑنے کے لیے پشاور تک پھونچے تو بنارس سے گنگ دیو اور کرن دیو کا بہرائچ پھونچنا کیا تعجب کی بات ہی۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ کرن دیو ملک کیرا (یعنی کانگڑہ پنجاب) تک گیا۔ (کتبہ ترجمہ اپی گریفیا انڈ کا جلد دوم صفحات ۲۹۷ - ۳۰۵) تاریخ نے اپنے آپ کو دُہرایا۔ محمود کے قصے تازہ تھے۔ اس لئے بہرائچ میں مسلمانوں کے قدم نہ جمنے دینے کی کوشش ہندو راجگان کے لئے ایک قدرتی امر تھا۔ اس سے ثابت ہی کہ رائے گنگ اور رائے کرن جن کا حوالہ مرآۃ مسعودی نے دیا ہی وہی راجگان ہیں جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا اور اس لحاظ سے جو زمانہ سپہ سالار مسعود غازی کا مرآۃ مسعودی نے قرار دیا وہ صحیح ہی۔ ۱۰۳۰ء سے لے کر ۱۰۴۲ء تک مسعود غزنوی محمود کا بیٹا غزنیں کی گدی کا مالک تھا۔ اُس کا خود اس طرف آنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہی وہ ۴۲۹ھ ۱۰۳۷ء میں صرف

سون پت ہانسی پنجاب تک آیا۔ بقول بیہقی (صفحہ ۴۹۷) کے مسعود غزنوی کا جنرل احمد نیال تگین دریائے گنگا کو پار کر کے بائیں ہاتھ کے راستہ سے بنارس پہونچا۔ درمیان میں اُس کا ر کنا یا بہرائچ کی طرف جاکر غزوات کرنا بیہقی یا کسی دوسری تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں گنگ دیو اور کرن دیو سے لڑنے والے مسلمان اور خاص کر وہ مسلمان جو ملک کیرا کے آس پاس تک پھیلے ہوئے تھے، سپہ سالار مسعود غازی اور اُن کے جاں نثاروں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں؟ یہی نہیں بلکہ سپہ سالار مسعود غازی کے اس زمانہ کے متعلق اور بھی اٹل شہادتیں ہیں۔ سُنئے۔ ہم نے اوپر بدایوں کے اُس پتھر کے کتبہ کا ذکر کیا ہے جو لکھن پور کے کتبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بدایوں کے اشٹراکوٹ (راٹھور) راجاؤں کا شجرہ اور بہت مختصر سی کارگزاری درج ہے۔ بدقسمتی سے اس کا ایک حصہ ٹوٹ گیا ہے اور اُس کی تاریخ تصنیف درج نہیں ہے۔ ہمارے صوبہ کے سابق سویلین مسٹر ہیرن آئی سی ایس کا خیال ہے کہ زبان کے لحاظ سے یہ کتبہ ۱۱۰۰ء کا ہے۔ مورخ ویدیا کی رائے ہے کہ ۱۱۰۰ء سے لے کر ۱۲۰۰ء تک کسی تاریخ کا ہے اور غالباً ۱۱۸۰ء کا ہے۔ ۱۱۸۰ء غالباً صحیح ہے کیوں کہ ۱۱۹۶ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی حوالی دہلی اور شمالی ہندوستان فتح کر لیا تھا۔ اس لئے ۱۲۰۰ء نہیں ہو سکتا۔ ہم اس کتبہ کی غیر ضروری عبارت کو چھوڑ کر صرف وہ حصہ لیں گے جس سے ہمارے مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نے بدایوں کے راجاؤں کے حسب ذیل نام لکھے ہیں:۔

(۱) چندر پال (۲) وگرہا پال (۳) بھون پال (۴) گوپال (۵) تری بھون پال (۶) مدن پال (۷) دیو پال (۸) بھیم پال (۹) سوریہ پال (۱۰) امرت پال، (۱۱) لکھن پال۔

لکھن پور کا کتبہ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھن پور متصل بدایوں آخری راجہ کے زمانہ میں آباد ہوا اور اسی راجہ کے زمانہ میں یہ کتبہ تصنیف ہوا

پہلے راجہ کی بابت لکھا ہی کہ اُس کے دشمن اُس سے ڈرتے تھے۔ پانچویں راجہ کی بابت وہ کہتا ہی کہ اُس نے دشمنوں کے کثیر گروہ کو عاجز کر دیا۔ اور اس لئے وہ مشہور ہو گیا چھٹے راجہ کی بابت لکھا ہی کہ اُس کی مشہور اور معروف قوّت کی وجہ سے ہمرا لوگوں کا (یعنی مسلمانوں کا) دیوتاؤں کے دریا یعنی گنگا کے اس پار آنے کا کبھی چرچا نہیں ہوا ساتویں راجہ کی بابت لکھا ہی کہ اُس نے لکھوکھا مغرور دشمنوں کو تباہ اور برباد کر دیا بھیم پال نے بہادر دشمنوں کو جو ناقابل فتح تھے شکست دی اور امرت پال نے اپنے ہاتھ کی تیز تلوار سے اُس نے اپنے دشمنوں کو ڈرایا۔ اس عبارت میں جو ایک درباری شاعر کے دماغ کا نتیجہ اور پُرانے زمانہ کے افسانہ آمیز اور گول مول عبارت کا ایک اچھا نمونہ ہی ہمارے نقطۂ خیال سے سب سے اہم بیان چھٹے راجہ مدن پال کی بابت جس کے سلسلہ میں مسلمانوں کا ذکر آتا ہی۔ اس عبارت پر مورخین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ مورخ ویدیا نے اس کا یہ مطلب لیا ہی کہ غالباً اس عبارت کا تعلق سپہ سالار مسعود غازی یا احمد نیال تگین سے ہی (جلد سوم صفحہ ۱۳۶) بعض دیگر اصحاب نے بھی ویدیا کی ہاں میں ہاں ملائی مگر قابل احترام مورخ مذکور ہم کو معاف کریں گے۔ اگر ہم اُن کی اس رائے سے اختلاف کریں۔ اس عبارت کے سیدھے سادے معنی یہ کیوں نہ لئے جائیں کہ راجہ مدن پال کے زمانہ میں مسلمانوں کے دریائے گنگ کے اس پار یا بہ الفاظ دیگر بدایوں کی طرف آنے کا کوئی چرچا نہیں جیسا کہ اس راجہ سے پہلے ہو چکا تھا۔ اگر اس راجہ کے زمانہ سے قبل ہمرا لوگوں کا وجود نہ تھا تو مقابلہ کر کے مصنف کتبہ کو اس راجہ کی یہ بڑھائی دکھانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پھر اس راجہ سے قبل کے یعنی پانچویں راجہ کی تعریف میں جو عبارت ہی اُس میں اور اُس سے قبل یعنی سب سے پہلے راجہ کی عبارت میں اس امر کی گنجائش ہی کہ مسلمان اُن کے زمانہ میں آئے ہوں۔ علاوہ اس کے بیہقی نے صاف طور پر بیان کیا کہ احمد نیال تگین

بائیں ہاتھ کے راستہ سے یعنی گنگا پار کر کے بنارس گیا اور کتبہ کہتا ہے کہ راجہ مدن پال کے زمانہ میں مسلمان گنگا کے اس پار آئے ہی نہیں۔ ایسی حالت میں چھٹے راجہ یعنی مدن پال کی عبارت سے مراد یقیناً سپہ سالار مسعود غازی یا احمد نیال تگین سے نہیں ہے ایسی حالت میں ہم مورخ ویدیا کی بات کیسے مان لیں۔ پھر اگر یہ مان لیا جائے کہ زبان کے لحاظ سے یہ کتبہ گیارہویں صدی عیسوی کا ہے یعنی سنہ ۱۰۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۱۰۰ء تک کا تو فی راجہ اوسط زمانہ قریب نو سال کے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی راجہ کم زمانہ تک گدّی پر رہا ہوگا اور کوئی نسبتاً زیادہ عرصہ تک۔ اس حساب سے پانچویں چھٹے راجہ کا زمانہ سنہ ۱۰۵۰ء کے آس پاس قرار پاتا ہے اور اگر اس کتبہ کو بقول ویدیا کے سنہ ۱۰۸۰ء کی تصنیف قرار دیا ہے تو فی راجہ سنہ ۱۰۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۰۸۰ء تک اوسط زمانہ میں قریب ساڑھے سات برس قرار پاتا ہے اور پانچویں راجہ تری بھون پال کا جس نے دشمنوں کے کثیر گروہ کو عاجز کر کے شہرت پائی۔ زمانہ قریب سنہ ۱۰۳۸ء کے قرار پاتا ہے اور یہ تقریباً وہی ہے جو بقول مرأۃ مسعودی کے سپہ سالار مسعود غازی کا زمانہ ہے۔ مرأۃ مسعودی نے سپہ سالار مسعود غازی کے بدایوں آنے کا حال نہیں لکھا مگر یہ اس کا یا مُلّا محمد غزنوی کا سہو ہے۔ کیوں کہ میرٹھ سے قنوج کا جس کا ذکر مرأت مسعودی میں ہے راستہ بدایوں ہو کر تھا۔ پھر آگے چل کر بدایوں کی روایتوں میں دکھائیں گے کہ سپہ سالار مسعود غازی اِدھر سے تشریف لائے۔ مصنف باقیات الصالحات نے لکھا ہے کہ کتاب محاربات ہند مصنفہ ملّا نور بدخشانی نے تفصیل کے ساتھ بدایوں کی جنگ کا حال لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہاں راجہ سے اور سپہ سالار مسعود سے ایک جھڑپ ہوئی اور سپہ سالار موصوف یہاں سے چلے گئے (ملاحظہ ہو پانچویں راجہ کی تعریف مندرجۂ بالا) اگر یہ صحیح ہے تو کوئی گنجائش شبہ کی نہیں رہتی کہ سپہ سالار مسعود غازی ضرور اس طرف آئے اور راجۂ وقت سے لڑے اور اُن کا زمانہ وہی تھا جو

مرآۃ مسعودی نے لکھا ہی۔ ان جملہ شہادتوں کی وجہ سے ہماری ناچیز رائے میں مرآۃ مسعودی
کو اس بارے میں نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہی۔

سپہ سالار مسعود غازی کی پیدائش کا مقام

اس کے بعد سپہ سالار موصوف کی جائے پیدائش کا مسئلہ پیش آتا ہی یہ پہلے مسئلہ سے بھی زیادہ کٹھن ہی کیوں کہ اس بارے میں مرآۃ مسعودی کا بیان
ایسا ہی جس کی صاف تائید دوسری تاریخوں سے نہ ملنے کی بنا پر مورخین نے
اس کتاب کو ناقابل اعتبار ٹھیرایا۔ مرآۃ مسعودی کا بیان ہی کہ جب محمود غزنوی
بہت سے ملک فتح کر لئے تو اُس کے دربار میں چار فریادی شخص اجمیر سے غزنین
پہونچے اور عرض کیا کہ مظفر خاں ہرمز کے مالک (صاحب) تھے۔ سلطان ابوالحسن نے
بڑے لشکر کے ساتھ مظفر پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ اُس کا اور اُس کے خاندان کا کام
تمام ہو جائے۔ مگر مظفر ہرمز سے بھاگ نکلا اور اجمیر میں آباد ہو گیا۔ مگر اب اجمیر کے
راجگان بھیرون گر اور سوم گر چند دیگر ہند سرداروں کے ساتھ مل کر اُس کو
اجمیر سے نکالنا چاہتے ہیں اس لئے مظفر خاں نے ہم کو فریاد لے کر بھیجا ہے کہ
اُس کی مدد کی جائے۔ محمود غزنوی نے یہ سُنکر وزیر حسن میمندی سے سوال کیا
اجمیر میں کس کا خطبہ پڑھا جاتا ہی یعنی وہ کس کی حکومت میں شامل ہی۔ وزیر نے
سوچ کر اور آداب شاہانہ کو ملحوظ رکھ کر جواب دیا کہ ابھی تو وہاں صرف
خدا اور رسول کے نام لیوا ہیں یعنی وہاں ابھی تک غزنوی تاجدار کا خطبہ نہیں
پڑھا جاتا۔ اس پر حسن میمندی کے مشورہ سے محمود غزنوی نے سالار شاہو کو اس
کام کے لئے منتخب کیا اور اُن کو موزوں سمجھ کر کچھ فوج کے ساتھ اجمیر بھیجا۔ یہ
سالار شاہو قندھار اور ٹھٹھ کی راہ سے ۱۱ ۱۰ ۱ ء ۴۰۱ھ میں اجمیر کے قریب پہونچے
تو مظفر خاں نے اُن کا استقبال کیا۔ یہ خبر سُن کر رائے بھیرون اور سوم گر

یا سوم کرن نے جنگی مصلحت کی بنا پر اجمیر کو خالی کیا اور رکھوکرہ پہاڑ کو پس پشت لے کر اپنی چھاؤنی جمائی۔ سالار شاہو سے اور ہندو سرداروں سے جنگ ہوئی جس میں فتح سالار شاہو کے ہاتھ رہی۔ ہندو سردار ہارے اور اُن میں سے بہت سے بھاگ کر اجمیر سے قنوج چلے آئے۔ سالار شاہو نے راجہ قنوج آجیپال (راجپال) کو پیغام دیا کہ وہ محمود کی اطاعت کرلے مگر راجہ نے اس بات کو اس کان سُنکر اُس کان اُڑا دیا۔ سالار شاہو نے راجہ کے اس برتاؤ کی محمود غزنوی کو اطلاع دی۔ سالار شاہو کے اجمیر میں آنے کے تھوڑے دن بعد اُن کی زوجہ بی بی ستر معلّیٰ وہاں آگئیں اور ۴۰۵ھ ۱۰۱۵ء میں سپہ سالار موصوف اجمیر میں پیدا ہوئے جس پر بڑا جشن منایا گیا اور محمود غزنوی بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے کی خاطر اجمیر آیا۔ یہ طویل بیان قطع نظر سپہ سالار موصوف کے تاریخی لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے۔ کیونکہ بعض مورخین کے قول کے مطابق اس سنہ میں اجمیر کا وجود ہی نہ تھا۔ پھر وہاں مسلمانوں کے پتے بھی نہ تھے۔ ۴۰۵ھ میں محمود غزنوی کا اجمیر میں آنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ بظاہر ہرمز مظفر اور سلطان ابوالحسن کا قصہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ ۴۰۱ھ میں احمد ابن حسن میمندی وزیر بھی تھا یا نہیں۔ اس لئے ہم کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان بیانات کو جانچنا پڑے گا تاکہ کھرے کھوٹے کا پتا چل جائے۔ بقول بیہقی و ڈاکٹر ناظم صدیقی (صفحہ ۱۳۶) کے ۴۰۵ھ ۱۰۱۴ء میں شمس الکفاۃ ابوالقاسم احمد ابن حسن میمندی محمود کا وزیر مقرر ہوا اور اس سے قبل یعنی ۴۰۱ھ میں جب کہ سالار شاہو کا اجمیر میں داخلہ بتایا جاتا ہے۔ ابوالعباس فضل وزیر تھا۔ مگر یہ اختلاف اس وجہ سے اہم اختلاف نہیں ہے کہ وزارت سے قبل بھی محمود غزنوی نے احمد ابن حسن میمندی کو بڑے بڑے عہدوں پر رکھا اور بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی (بحوالہ آثار الوزرا) کے اُس نے محمود کے ساتھ پرورش پائی تھی۔ اس لئے

سنہ ۴۱ھ محمود کا اُس سے مشورہ کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہی۔ تعجب تو یہ ہی کہ اُس زمانہ میں اجمیر میں مسلمانوں کی موجودگی بتائی جاتی ہی یا مظفر جزیرۂ ہرمز سے چل کر غیر ملک اور غیر کفو میں ہوتا ہوا اجمیر تک پہونچتا ہی۔

جزیرۂ ہرمز ہرمز ایک جزیرہ ہی جو خلیج فارس میں شیراز کے سامنے واقع ہی۔ یہ اُس زمانہ میں صوبۂ فارس کی حکومت میں شامل تھا۔ بقول طبقات ناصری (ترجمہ انگریزی صفحہ ۳۸۳) کے اس کو خاندان بویہ کے حکمران ابی بکر اتابک بن سعد زنگی نے فتح کیا تھا۔ یہ وہی جزیرہ ہی جہاں سے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ فاروق کے زمانہ میں پارسی ایران کو چھوڑ کر ہندوستان میں آئے۔ بقول المقدسی مصنف جغرافیہ احسن التقسیم فی معرفت الاقالیم (ترجمہ انگریزی رینکن) کے اس جزیرہ کا پرانا نام آستان ہرمز تھا اور ایک زمانہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل یہ ہندوستانی تجارت کا مرکز تھا۔ جہازوں کے ذریعہ سے عرب قافلے اس جزیرہ پر ہوکر ہندوستان میں اپنا مال لاتے تھے اور یہاں سے ہندوستانی سامان لے جاتے تھے۔ مطلع السعدین و مجمع البحرین مصنفہ عبدالرزاق (ترجمہ ایلیٹ جلد چہارم صفحہ ۹۵ نے لکھا ہی کہ ہرمز نویں صدی ہجری میں بھی بڑا بندرگاہ اور تجارت کی جگہ تھا) اب دیکھیں کہ مظفر نام فرضی ہی یا اصلی۔ حمداللہ مستوفی قزوینی اپنی مشہور تاریخ گزیدہ مصنفہ سنہ ۱۳۳۰ء میں لکھتا ہی کہ سنہ ۳۲۱ھ / ۹۳۳ء میں مظفر بن یاقوت خلیفہ بغداد کی طرف سے صوبۂ اصفہان کا گورنر تھا اور جب اُس کو علی بویہ نے شکست دی تو وہ بھاگ کر شیراز میں آیا اور بعد کو عمادالدولہ ابوالحسن نے شیراز پر بھی قبضہ کرلیا (ترجمہ انگریز ایڈورڈ براؤن جلد دوم صفحہ ۸۶۰) اُس بیان کی تائید طبقات ناصری کے فاضل مترجم میجر راورٹی کے ایک نوٹ سے بھی (جو صفحہ ۵۵ ترجمہ انگریزی پر ہی) ہوتی ہی۔ ابوالحسن عمادالدولہ دیلمی کے متعلق ابن خلدون نے بھی لکھا ہی کہ وہ شیراز پر قابض ہوگیا۔ اس لئے کیا تعجب ہی کہ مظفر بن یاقوت شیراز سے

بھاگ کر دو قدم پر (اگر سمندر حائل ہونے کی وجہ سے محفوظ مقام) ہرمز میں آگیا ہو اور پھر جب یہاں بھی دباؤ پڑا تو ہندوستان بھاگ آیا ہو۔ اب اس واقعہ میں دقت یہ پیش آتی ہے کہ کہاں ۱۸۰ھ اور کہاں ۳۴۰ھ / ۹۳۳ء دونوں میں اسّی برس کا فرق ہے تو کیا مظفر بن یاقوت اس قدر معمر آدمی تھا۔ اس بارے میں ممکن ہے کہ مرآۃ مسعودی نے تاریخ ملّا محمد غزنوی کے پورے بیانات کے اخذ کرنے میں غلطی کی ہو۔ مگر اس کی بنا پر پوری کتاب ناقابل اعتبار نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ محمودی زمانہ میں ابو الحسن اور مظفر نام کے اور بھی اشخاص تھے۔ مثلاً ابو الحسن محمد بن ابراہیم سیمجو جو ۳۶۱ھ / ۹۷۱ء میں ملوک سامانی کی طرف سے خراسان کا گورنر تھا اس کا بیٹا ابو علی تھا اور ابو علی کا بیٹا اور ابو الحسن محمد کا پوتا بھی ابو الحسن نام رکھتا تھا۔ یہ آخر الذکر ابو الحسن اپنے باپ کے مرنے کے بعد بویہ خاندان کے بادشاہ فخر الدولہ دیلمی کے پاس جُرجان چلا گیا۔ یہ محمود کا ہم عصر ضرور تھا مگر ہم کو کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلا کہ اس آخر الذکر ابو الحسن کو فخر الدولہ بویہ نے شیراز یا ہرمز بھیجا ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طریقہ سے بقول بیہقی کے مسعود بن محمود کے زمانہ میں ایک افسر مظفر حاکم نامی ندیم تھا۔ مگر اس کا محمود غزنوی کے زمانہ میں پتا نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ہرمز سے اس کا کوئی تعلق تھا، یا وہ وہاں سے بھاگ کر ہندوستان آیا ہو۔ سر ہنری الیٹ کے اقتباس کے ترجمہ میں بجائے صاحب ہرمز کے حاجب ہرمز درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قابل مورخ کے سامنے مرآۃ مسعودی کا جو نسخہ تھا وہ غلط تھا۔ ہم نے کئی ایک نسخوں میں صاحب (ص، ا، ح، ب) پایا۔ اپنے نسخہ کی بنا پر سر ہنری الیٹ نے ترجمہ "نوکر ہرمز" کیا ہے۔ اس لئے دیکھنا ہے کہ اگر سر ہنری الیٹ کا نسخہ صحیح ہے اور ہرمز بجائے جزیرہ کے کسی شخص کا نام تھا تو اس نام کا کوئی شخص تھا بھی یا نہیں۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ صمصام الدولہ دیلمی کے زمانہ یعنی ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء میں اور بہاء الدولہ

دیلمی کے زمانہ یعنی بـ ۳۹۱ھ ؁۱۰۰۱ء میں جو محمود کی حکومت کا شروع کا زمانہ ہی ایک شخص ابو صغیر تھا جو اُستاد ہرمز کے نام سے مشہور تھا۔ مگر اس کے اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ان وجوہ سے ہم یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جو نام مرآۃ مسعودی نے دیئے ہیں وہ فرضی نہیں ہیں یہ دوسری بات ہی کہ اخذ کرنے میں یا نقل کرنے میں اصلی عبارت کچھ سے کچھ ہو گئی ہی۔ ہرمز سے چل کر اجمیر پہونچنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہی۔ مسلمان تو اس زمانہ میں چین تک جاتے تھے۔ آج کل کی طرح سے اُن پر ادبار اور اُن میں جمود نہ تھا۔ ہمت اور حوصلہ کے لحاظ سے وہ اُس زمانہ میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ آخر اس سے پہلے اور حضرت عمر رضؓ فاروق کے زمانہ ہی سے ساحلِ ہند پر مسلمانوں کی آمد رفت شروع ہو ہی گئی تھی۔ ہاں سوال یہ ہی کہ بـ ۱۰۱۸ھ ؁۱۰۱ء میں یعنی محمود غزنوی کے زمانہ میں اجمیر میں مسلمان موجود بھی تھے یا نہیں۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی مسئلہ ہی اس لئے ہم اس پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

محمود غزنوی کے زمانہ میں اجمیر کا وجود اور وہاں مسلمانوں کی موجودگی

ڈاکٹر ناظم صدیقی، ونسینٹ اسمتھ اور بعض دیگر مورخین کا خیال ہی کہ محمود غزنوی کے زمانہ میں اجمیر آباد نہیں ہوا تھا اور فرشتہ کی یہ روایت کہ جب محمود سے لڑنے کے لئے پنجاب کے ہندو شاہی خاندان کے راجہ اجے پال نے دیگر راجاؤں کو بلایا تو اُن میں راجہ اجمیر اور اُس کی فوج بھی تھی غلط ہی۔ مورخین کے اس گروہ کے خیال میں اجمیر کی بنا سب سے پہلے راجہ اجے پال یا اجے دیو نے ۱۱۰۰ء میں یعنی محمود کے انتقال کے اسی برس بعد ڈالی۔ اگر ان مورخین کا یہ خیال صحیح ثابت ہو تو صاف ظاہر ہی کہ فرشتہ مرآۃ مسعودی اور دیگر مخالف مورخین کی اجمیر کے وجود کے بارے میں روایتیں غلط قرار پائیں گی۔ اس بارے میں تاریخی شہادت دو قسم کی ہی یعنی اول تو وہ جو کتبہ جات اور ناقابل تردید ذرائع پر مبنی ہی

اور دوسری وہ جن کا دار و مدار مقامی روایتوں پر ہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجمیر کی بنا اجے پال چوہان نے ڈالی جیسا کہ اُس کے نام سے ثابت ہی یعنی راجہ اجا کا پہاڑ (آج - میرو بہ یعنی پہاڑ) چوہانوں کی راجدھانی سانبھر میں تھی جس کا اصلی اور پُرانا نام سالم بھری تھا۔ اس لئے اجمیر شروع میں یقیناً سانبھر کا ماتحت تھا اب راجہ اجے پال یا اجے دیو کے زمانہ کا تعین ہو جائے تو اجمیر کی عمر کا تعین بھی ہو جائیگا اجمیر میر وارہ گزیٹیر مصنفہ مسٹر جے ڈی لاٹوش (جو بعد کو ہمارے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر جمیس لاٹوش کے نام سے ہوئے) کا بیان صفحہ ۱۲ پر ہی کہ ۶۸۵ء میں (صحیح ۷۱۵ء) میں محمد قاسم ثقفی کی فوج نے اجمیر کو فتح کیا اور راجہ ڈولا رائے اُن کے ہاتھوں مارا گیا ممکن ہی کہ کہا جائے کہ اجمیر گزیٹر کی یہ روایت کرنل ٹاڈ صاحب کی کتاب راجستھان پر مبنی ہی جو در اصل غیر معتبر افسانوں کا مجموعہ ہی۔ کیونکہ ٹاڈ صاحب نے بھی جلد اول صفحہ ۱۱۴ پر یہی لکھا ہی جو گزیٹر نے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈولہ رائے راجہ اجے پال یا اجے دیو کا بیٹا تھا۔ ٹاڈ صاحب نے یہ روایت بھی درج کی ہی کہ راجہ بیر بلن سے اور محمود سے اجمیر میں لڑائی ہوئی اور اُس کا ذکر اُس کتبہ میں ہی جو رائے پتھورا کی لاٹ پر ہی جس کو لوگ عموماً قطب صاحب کی لاٹ کہتے ہیں اور جو دہلی میں نصب ہی۔ اگر لاٹوش صاحب اور ٹاڈ صاحب کے بیانات کو ہم افسانہ بھی تصور کر لیں تو بھی ہمارے پاس دیگر وجوہ اس قیاس کے ہیں کہ محمود غزنوی کے زمانہ میں اجمیر کا وجود تھا اور فرشتہ کی روایت صحیح ہی۔ کتاب انڈین اینٹی کواری جلد ۸ صفحہ ۵۸ نے سنسکرت کی رزمیہ نظم مہا کاویا ہمرا کا جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہی ایک اقتباس دیا ہی۔ یہ نظم علاء الدین خلجی اور رن تھم بور کے چوہان راجہ ہمرا کے لڑائیوں کے بارے میں ہی مگر اس میں چوہانوں کا شجرہ دیا ہی اس شجرہ کا نمبر سلسلہ ۱۲ راجہ سنگھا ہی اس کے بارے میں اس نظم کا بیان ہے کہ اس نے مسلمانوں کے

جنرل حتیم کو ہرایا۔ یہ خرابی حکم یا حاتم یا ہشام کی ہے۔ اس کتاب کے حساب سے راجہ سنگھا کا زمانہ نویں صدی عیسوی کے آخر یا دسویں صدی عیسوی کے شروع میں تھا کیونکہ سنگھا کے بعد تیسرے راجہ وگرہا راج سے اور گجرات کے راجہ مولراج سے لڑائی ہوئی اور مولراج کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کے وسط میں تھا۔ بقول تاریخ ہند ہاشمی صاحب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن (جلد دوم کے جس نے تاریخ تحفۃ الکرام کا مصنفہ حوالہ دیا ہے حکم اور ہشام سندھ کے عرب گورنروں میں سے گزرے ہیں۔ اب اگر یہ لوگ سانبھر اور رن تھم بور کے راجاؤں سے لڑے تو صاف ظاہر ہے کہ ۸۰۰ء سے یعنی محمود کے زمانہ سے بہت قبل مسلمان یہاں پہونچ گئے تھے اور یہ مسلمانوں کی عادت تھی کہ جب ایک جگہ پہونچ جاتے تھے تو باوجود شکستوں کے تھوڑی بہت تعداد میں باقی رہ جاتے تھے اس قیاس کو بھی جانے دیجئے اور آگے چلئے۔ ٹاڈ صاحب صفحہ ۱۴۵۷ جلد سوم راجستھان میں لکھتے ہیں کہ کتبہ جات کی بنا پر اجمیر کے راجہ بسال دیو کا زمانہ ۱۰۰۱ء سے لے کر ۱۰۷۰ء تک ماننا چاہیئے۔ یعنی محمود کا ہم عصر۔ اس میں ایک جگہ بیر بلن دیو کی روایت ہے اور دوسری جگہ بسال دیو کی۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی ہوں (سانبھر کا راجہ اجمیر کا راجہ بھی سمجھا جاتا تھا) کتبہ بجولیا سے ثابت ہے کہ انو راجہ ۱۱۰۸ء میں اجمیر کی گدی پر بیٹھا تو اُس نے آنا ساگر بنا کر ملیچھوں سے اجمیر کو پاک کیا (ویدیا جلد سوم صفحہ ۱۴۸ بحوالہ کتبہ بجولیا مندرجہ راجپوتانہ گزیٹیر)

اس سے ثابت ہے کہ ۱۱۰۸ء سے قبل اجمیر کا وجود تھا۔ کہا جائے گا کہ ونسنٹ اسمتھ اور ڈاکٹر ناظم صدیقی کا بھی یہی مقولہ ہے کہ اجمیر کی بنا ۱۱۰۰ء میں پڑی۔ دکھانا تو یہ ہے کہ محمود کے زمانہ میں یعنی ۱۰۰۰ء میں اجمیر کا وجود تھا۔ اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ کتبہ بجولیا کے شجرہ کے حساب سے اجے پال اور انو راجہ کے درمیان (جو کہ ۱۱۰۸ء میں تھا) چھ[۶] پشت کا فرق ہے۔ اگر فی پشت اوسط زمانہ بیس[۲۰] سال کا

رکھیں اور اس زمانہ کو ۱۱۰۸ء یعنی انوراجہ کی گدی پر بیٹھنے کے سال سے نکال دیں تو اجے پال کا زمانہ ۹۵۸ء میں آ تا ہی چہ جائے کہ ایک راجہ یعنی بسال دیو نے کم از کم ۶۴ سال حکومت کی۔ ایسی حالت میں اجمیر کو اجے پال نے یقیناً ۱۰۰۰ء سے قبل بسایا۔ ڈاکٹر ناظم صدیقی صاحب کی یہ دلیل کہ اجمیر محمود کے راستوں سے دور اور دقتوں سے پُر تھا کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ محمود کا عزم بالجزم، استقلال محنت اور مشقت دیکھتے ہوئے یہ دقتیں غائب ہو جاتی ہیں۔ کیا کشمیر کے پہاڑی علاقہ کی فتح سومنات سے واپسی کا سفر اور کچھ کی رن میں سے ہو کر سلامت غزنی پہنچ جانا کم دقت طلب تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ محمود غزنوی مرآۃ مسعودی کے قول کے مطابق سپہ سالار مسعود غازی کی پیدائش کے وقت اجمیر میں آیا ہو۔ یا بقول لاٹوش صاحب اور ٹاڈ صاحب کے کسی دوسرے موقعہ پر یا بقول بعض مورخین کے سومنات جاتے وقت۔ بہرحال ہماری ناچیز رائے میں ان وجوہ کی بنا پر محمود کے زمانہ میں اجمیر کا وجود تھا اور فرشتہ کے قول کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ وہاں مسلمان اُس زمانہ میں تھے یا نہیں کوئی مشکل مسئلہ نہیں رہ جاتا سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کتبۂ بجولیا کی رو سے جب ۱۱۰۸ء میں انوراجہ نے اجمیر کو ملیچھ لوگوں سے پاک کیا تو وہاں اگر اس سے قبل مسلمان نہ تھے تو اجمیر کے پاک ہونے کے کیا معنی۔ کہاں سے آئے پھر قاسم ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کی فوجیں قنوج کے حدود تک پھونچیں جو اُن کے زمانہ میں اجمیر سے ملحق تھیں۔ ابوریحان البیرونی اور چاچنامہ (ترجمہ سرہنری ایلیٹ جلد اول صفحہ ۲۰۸) سے معلوم ہوتا ہی کہ جب محمد قاسم ثقفی رحمۃ اللہ علیہ سندھ سے قنوج فتح کرنے کے ارادے سے چلے تو اُدے پور تک پھونچے مگر خلیفہ بغداد نے اُن کو واپس بلا لیا۔ اب اُدے پور سے اجمیر کتنی دُور رہ گیا جو مسلمانوں کو وہاں پھونچنے میں دقت تھی۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ مورخ حسن نظامی اپنی کتاب تاج المآثر

میں جواب کم یاب ہے اور جو بارہویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی (ترجمہ انگریزی ایلیٹ جلد دویم صفحہ ۲۱۵ - ۲۲۶ پر) لکھتے ہیں کہ قطب الدین ایبک کے اجمیر فتح کرنے کے بعد مذہب اسلام یہاں دوبارہ جاری ہوا۔ لفظ دوبارہ قابل غور ہے۔ یہ عبارت اس وجہ سے مبہم ضرور ہے کہ قطب الدین ایبک نے اجمیر پر دو حملے کئے اور ممکن ہے کہ دوبارہ سے مراد دوسرے حملہ کے نتائج سے ہو۔ مگر پوری عبارت پڑھنے کے بعد ہماری ناچیز رائے میں یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ قطب الدین ایبک کے پہلے حملہ سے قبل بھی اجمیر میں مسلمان موجود تھے۔ اس سے قبل شہاب الدین محمد بن ہشام غوری کی فوجیں آئیں تو بجز محمودی فوجوں کے اور مسلمان کون ہو سکتے تھے۔ مغرب و شمال میں ملتان اور پنجاب پر محمودی حملوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ شمالی اور مغربی ہند میں جگہ جگہ مسلمانوں کی بستیاں قائم ہو گئی تھیں اور ادھر اجمیر کے قریب نار دین یا نراین پور پر بھی محمود کا ایک حملہ ہوا۔ بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی کے یہ مقام ریاست الور میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب ہم نے ریاست الور کا نقشہ دیکھا تو ہم کو محض ایک مقام نراین پور ہی نہیں ملا بلکہ اُس سے جنوب مشرق میں ایک مقام تھانہ غازی کے نام سے اور ریواری کے قریب شاہراہ عام کے قرب میں ہم کو ایک مقام سالار پور بھی ملا۔ نرائن پور سے اجمیر سو سوا سو میل ہو گا۔ العتبی نے (صفحہ ۳۶۲ ترجمہ ایلیٹ انگریزی پر) لکھا ہے کہ نردین فتح کرنے کے بعد محمود نے اپنے ملازم اور افسر یہاں چھوڑے۔ تعجب نہیں ہے کہ تھانہ غازی انھیں حضرات کی یادگار ہو۔ ان سب واقعات سے ہماری رائے میں یہ نتیجہ غلط نہ ہو گا کہ جب چاروں طرف سے اجمیر کے ملحقات مسلمانوں سے گھرے ہوئے ہوتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ محمود کی نظر اجمیر پر نہ پڑی ہو اور وہاں مسلمان موجود نہ ہوں۔ یہی خیال سر ہنری ایلیٹ جیسے قابل مورخ نے مرآۃ مسعودی کی بنا پر اپنے نوٹ میں ظاہر کیا ہے کہ محمود کے زمانہ میں اجمیر میں غالباً

مسلمان موجود تھے۔

ان مسائل کے بعد ایک مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ بہیردن گر یا سوم گر یا سوم کرن،
کون تھے؟ بجز مرآۃ مسعودی کے یہ نام دوسری جگہ نہیں ملتے۔ نہ توٹاڈ صاحب کے
راجستھان میں ان کا تذکرہ ہے۔ نہ اجمیر گزنیٹر یا کسی دوسری تاریخ میں۔ البتہ بقول اجمیر
گزنیٹر کے ایک راجہ سومیشور ضرور تھا جو انوراجہ سے دوسری پشت میں تھا مگر ہم دکھا چکے
ہیں کہ انوراجہ ۱۱۳۰ء میں گدی پر بیٹھا۔ ایسی حالت میں سومیشور اور سپہ سالار مسعود غازی
کا زمانہ ایک نہیں ہوسکتا۔ اس لئے خیال پیدا ہوتا ہے کہ مرآۃ مسعودی والے بہیردن گر
اور سوم گر جو بظاہر گسائیوں کے نام معلوم ہوتے ہیں سانبھر کے چوہانوں کے ماتحت
مقامی افسر ہونگے۔

یہاں ایک ضمنی بات اور بھی یاد آئی۔ اگرچہ اس کا تعلق ہمارے مضمون سے نہیں
ہے مگر چونکہ تاریخی لحاظ سے اس میں جدت ہے اس لئے عرض کرتے ہیں۔ مرآۃ مسعودی نے
لکھا ہے کہ اجمیر پر سپہ سالار شاہو کے تسلط کے بعد وہاں کے ہندو سردار راجپال کے پاس قنوج
بھاگ گئے اور سالار شاہو نے راجہ قنوج کے پاس پیام بھیجا کہ وہ محمود کی اطاعت کرے
ساتھ ہی ساتھ محمود کو لکھا کہ یہ بھاگے ہوئے ہندو سردار مسلمانوں کی (سرحدی)
فوج کو دق کرتے رہتے ہیں اور راجہ قنوج کو بادشاہ کے خلاف ابھارتے رہتے ہیں۔
کیا تعجب ہے کہ قنوج پر محمود کا حملہ محض لوٹ مار کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ سالار شاہو کی
رپورٹ پر پولیٹکل دور اندیشی، سیاسی ضرورت اور اپنی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی
مصلحت پر مبنی ہو۔ کئی ایک مورخین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بہ نسبت دکھن کے راجاؤں کے
جہاں تجارت کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ واسطہ
پڑتا رہتا تھا۔ قنوج کا راجہ اپنے مذہب میں پکا تھا اور پنجاب کے راجہ کو محمود غزنوی
کے خلاف امداد دیتا رہتا تھا۔ بقول مرآۃ مسعودی کے قنوج کے حملہ میں محمود نے

سالار شاہو کو بھی ساتھ رکھا۔ ان وجوہ کی بنا پر مرآۃ مسعودی کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور بظاہر اُس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجوہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔

اس قدر عرض کرنے کے بعد اب ناظرین خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ مرآۃ مسعودی کے بیانات کو افسانہ آمیز کہکر ٹھکرا دینا کہاں تک جائز ہوگا۔ ہمارے نزدیک تو ان بیانات سے مرآۃ مسعودی نے دو چار باتیں چھوڑ کر تاریخ پر ایک نئی روشنی ڈالی ہے جو ممکن ہے کہ اس تجسس، تحقیقات اور انکشافات کے زمانہ میں آگے چل کر اور زیادہ تیز ہو جائے۔

باب سوم

پرورش، غزوات سے قبل ہندوستان میں قیام

اب ہم دکھائیں گے کہ سپہ سالار مسعود غازی نے کہاں اور کس حال میں پرورش پائی۔ بقول مرآۃ مسعودی کے جب محمود غزنوی نے ۴۰۷ھ ۱۰۱۶ء (صحیح ۴۰۹ھ ۱۰۱۸ء) میں قنوج پر حملہ کیا تو سپہ سالار مسعود غازی اپنی والدہ ماجدہ کے پاس اجمیر میں رہے قنوج سے واپسی کے بعد محمود نے سالار شاہو کو لاہور بھیجکر واپس کر دیا اور وہ اجمیر آگئے۔

سپہ سالار کی تعلیم

جب سپہ سالار مسعود غازی کی عمر قریب ساڑھے چار سال کے ہوئی تو سید ابراہیم کی اُستادی میں اُن کی تعلیم بسم اللہ ہوئی۔ چونکہ ذہین اور طباع تھے اس لئے دس سال کی عمر میں خاصی ترقی کر لی۔ محمود اُس وقت خراسان کی مہموں میں مصروف تھا۔ اس مصروفیت کو دیکھکر دامنِ کوہ کی رعایا نے

محمود کے گورنر ملک چھجو کو دق کرنا شروع کیا۔ اُنھوں نے محمود سے شکایت کی۔ اس پر سالار شاہو کا تبادلہ اجمیر سے کاہلیر کو کر دیا گیا کہ وہاں کا انتظام کریں۔

سفر کاہلیر

سالار شاہو اپنے اکلوتے بیٹے کو اور بی بی ستر معلیٰ کو اجمیر چھوڑ کر کاہلیر چلے گئے۔ یہ جگہ قنوج کو جاتے وقت محمود کے ہاتھ آئی تھی کلیچند وہاں کا راجہ تھا۔ سپہ سالار مسعود غازی کی عمر اس وقت دس سال کی تھی مگر باوجود صغر سنی ہر قسم کی تعلیم میں جو شرفا کے اور اونچے گھرانے والے بچوں کو اس وقت دی جاتی تھی کافی ترقی کر لی۔ شکار، نیزہ بازی، تیراندازی، گھوڑے کی سواری وغیرہ میں پوری مہارت ہو گئی۔ جب سپہ سالار شاہو کا کاہلیر پر تسلط ہو گیا اور محمود غزنوی نے مستقل طور پر اُن کو وہاں رہنے کا حکم دیا تو سالار شاہو نے بی بی ستر معلیٰ اور سپہ سالار مسعود غازی کو بھی کاہلیر میں طلب کر لیا۔ سپہ سالار مسعود غازی دورانِ سفر میں شکار کھیلتے کھیلتے قصبہ راول میں پہونچے۔ یہاں کا راجہ شیوگن تھا جو محمود کے وزیر احمد ابنِ حسن میمندی کا سالا تھا۔ وزیر سالار شاہو اور سپہ سالار مسعود غازی سے بہت جلتا تھا کیونکہ ان کے حال پر محمود کی بڑی مہربانیاں رہتی تھیں۔

سپہ سالار مسعود غازی کو زہر دینے کی کوشش

اس راجہ شیوگن نے بظاہر تو بڑی خاطر و مدارات کی اور کھانے کی دعوت دی مگر دراصل اُن کو زہر دینے کا انتظام کیا۔ سپہ سالار مسعود غازی نے دعوت کو قبول کرنے سے معذرت کر کے ٹال دیا تو شیوگن نے دو سو من مٹھائی بھیجی سپہ سالار مسعود غازی کو شبہ ہوا تو اوّل کتّوں کو کھلائی گئی۔ معلوم ہوا کہ اُس میں زہر تھا۔ جب یہ بھید کھلا تو بی بی ستر معلیٰ نے خیال ظاہر کیا کہ ہو نہ ہو اس میں احمد حسن میمندی کی سازش ہے۔ سپہ سالار مسعود غازی شکار کے حیلہ سے دوبارہ قصبہ راول میں آئے اور شیوگن کو اُس کی نازیبا حرکت پر سزا دینے کی غرض سے حملہ کر دیا۔ شیوگن گرفتار ہوا۔ سپہ سالار

مسعود غازی نے کاہلیر پہونچنے پر شیوگن کی شکایت کی جس کی اطلاع محمود کو دی گئی۔
مگر قبل اس کے کہ سالار شاہو کی رپورٹ پہونچے شیوگن کے بھائی نراین نے محمود سے
سپہ سالار موصوف کی شکایت کردی جس پر محمود کو بہت تعجب ہوا۔ مگر جب سپہ سالار کی
رپورٹ پہونچ گئی تو محمود نے حکم دیا کہ شیوگن نگرانی میں رکھا جائے۔ بادشاہ خود اس
معاملہ کی تحقیقات کرے گا۔ اس پر احمد ابن حسن میمندی کے گھر میں ماتم برپا ہو گیا کہ اب
خیر نہیں۔ سپہ سالار مسعود غازی کی عمر اس زمانہ میں بارہ[۱۲] سال کی تھی۔ آئیے دیکھیں کہ
اس انوکھے اور دلچسپ بیان کی کہیں اور سے بھی تائید ہوتی ہے یا یہ محض افسانہ
ہی افسانہ ہے۔ مرآۃ مسعودی کے اس بیان سے کہ سالار شاہو اپنے بیٹے کو دس سال
کی عمر کا چھوڑ کر کاہلیر گئے اور جب سپہ سالار مسعود کاہلیر پہونچے تو ان کی عمر بارہ[۱۲] سال
کی تھی۔ یہ واقعات سنہ ۴۱۴-۱۵ھ سے لے کر سنہ ۴۱۶-۱۷ھ تک کے ہیں۔ مرآۃ مسعودی کا
یہ بیان تو قطعی غلط ہے کہ محمود سنہ ۴۱۴-۱۵ھ / ۱۰۲۳ء میں خراسان کی مہم میں مشغول تھا۔ بقول ڈاکٹر
ناظم صدیقی کے جنھوں نے یہ روایت گردیزی کی بنا پر کی ہے صرف اس قدر صحیح ہے کہ
سنہ ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء میں محمود نے سلجوقیوں کو جو دق کرتے رہے تھے خراسان میں آباد کیا۔

کاہلیر کون جگہ تھی؟

اب مرآۃ مسعودی کے اس بیان میں سب سے پہلی بات
جانچنے کی یہ ہے کہ کاہلیر کون جگہ تھی۔ حال کے جغرافیوں اور
نقشوں میں تو اس نام کی کوئی جگہ ملتی نہیں۔ مرآۃ مسعودی نے اس مقام کے
اتنے پتے دیئے ہیں کہ وہ دامنِ کوہ کشمیر میں واقع تھا۔ اس کا قلعہ بہت بلند تھا، وہاں
کے لوگ متمرد (سرکش) تھے۔ وہاں جاتے وقت قصبہ راول راستے میں پڑا۔ قنوج پر
حملہ کے وقت محمود نے اس مقام کو فتح کیا تھا۔ ملک چھچھو یہاں کا گورنر تھا۔ آگے چل کر
مرآۃ مسعودی نے لکھا ہے کہ جب غزنین سے دوبارہ سپہ سالار مسعود غازی غزوات
کی غرض سے ہندوستان میں آئے تو اول اپنے والدین کے پاس کاہلیر گئے اور

وہاں سے چل کر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پرشیت پور یا شیو پور کے قریب دریا کو عبور کیا
اب ان پتوں کو کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم کو کاہلیر کا کھوج لگانا ہوگا۔ سال کے حساب سے تو
پتا لگانا ممکن اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہمارے مورخین نے کوئی ایسی جدول نہیں چھوڑی
جس میں بقید تاریخ اور سال وہ جملہ مقامات درج ہوں جو محمود نے فتح کئے۔ البتہ بڑے
بڑے مقامات کی تاریخی یادداشتیں موجود ہیں۔ علاوہ اس کے قنوج کی فتح کے سال میں
مورخین میں اختلاف ہے۔ تاریخ کامل مصنفہ ابن الاثیر اس کو ۴۰۷ھ / ۱۰۱۶ء بتاتی ہے جیسا کہ
مرآۃ مسعودی نے لکھا ہے اور بحوالہ عتبی، گردیزی ابن الجوزی کے ڈاکٹر ناظم صدیقی
رکھو ۴۰۹ھ / ۱۰۱۸ء شعبان ہشتم بتاتے ہیں اور چونکہ زیادہ تر مورخین کا اس پر اتفاق ہے
اس لئے یہ بھی سال صحیح مانا جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمہ طور پر محمود غزنوی قنوج جاتے
وقت دامن کوہ کشمیر ہی ہوتا ہوا گیا۔ مگر ان سب مقامات کے نام نہیں ملتے۔ اس کے بعد
خیال پیدا ہوتا ہے کہ تجنیس خطی اور مرور ایام کا لحاظ کرتے ہوئے کاہلیر کوٹ کانگڑا پنجاب
یا موجودہ پیرانِ کلیر سہارنپور صوبۂ متحدہ کی خرابی تو نہیں ہے مگر یہ دونوں خیال بھی
اس وجہ سے غلط معلوم ہوتے ہیں کہ ان میں سے کوئی مقام حدود کشمیر پر اُس زمانہ میں
واقع نہ تھا۔ اگرچہ بہ نسبت آج کل کے کشمیر کی حدود اُس وقت زیادہ وسیع تھیں۔
علاوہ ان کے اجمیر سے چل کر ان دونوں مقامات پر پہونچنے کے لئے نہ قصبۂ راول
درمیان میں پڑتا تھا اور نہ کوئی راجہ شیو گن اس طرف تھا اور نہ وہاں سے ملتان
آنے کے لئے جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا، دریائے سندھ کو عبور کرنا یا اُس تک
جانا ضروری تھا۔ کوٹ کانگڑا میں ایک قلعہ بلند اور مضبوط ضرور تھا جس کو محمود نے
بڑی مشکل سے فتح کیا۔ مگر بقول گردیزی (ڈاکٹر ناظم صفحہ ۹۰-۸۹) محمود نے اس کو
۳۹۹ھ / ۱۰۰۸ء و ۱۰۰۹ء) کے آخر میں ہی فتح کر لیا تھا اور نہ یہاں کسی گورنر جھجو ملک
نامی کے تقرر کا ثبوت ہے۔

پیرانِ کلیر میں کسی پرانے قلعہ کے کوئی آثار نہیں ہیں اور نہ یہ دامنِ کوہ کشمیر میں ہے
اس لئے ان دونوں مقامات کو ذہن سے خارج کرکے دیگر مقامات کی جانچ کرنا ہوگی۔
بابر بادشاہ نے تزک بابری (ترجمہ انگریزی مسز بی وریج) نے لکھا ہے کہ کشمیر جاتے وقت
راجہ کاہلور اس سے ملنے آیا اور یہ کہ کاہلور پہاڑ میں بڑا مضبوط قلعہ ہے۔ اس سے خیال
پیدا ہوسکتا ہے کہ کاہلیر سے کاہلور ہوگیا ہو۔ یا مترجم کی رائے ہے کہ یہ جگہ شملہ کے پہاڑی
ریاستوں میں سے ہے۔ ہم کو نقشہ پر کسی ایسی ریاست کا نام نہیں ملا لیکن مراۃ مسعودی
کا کاہلیرا اور کاہلور بھی ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ جگہ سپہ سالار مسعود غازی کے راستہ
سے بہت ہٹی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ناظم صدیقی کے نوٹ صفحہ ۱۰۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان
محمود نے کشمیر کو فتح کرنے کی غرض سے اس پر دو حملے کئے پہلا ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء (بحوالہ گردیزی)
اور دوسرا ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء میں۔ پہلے حملہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ کشمیر کے جنوب مغربی پہاڑیوں
کی ریاستوں نے محمود کی اطاعت کرلی ۴۰۶ھ میں اور ۴۰۷ھ میں جس کو
مراۃ مسعودی نے قنوج کے حملہ کا سال بتایا ہے یا ۴۰۹ھ میں جس میں قنوج واقعی
فتح ہوا کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ کشمیر کے جنوب مغربی پہاڑیوں میں قصبہ راول (موجودہ
راولپنڈی) بھی واقع ہے اور اسی حصہ میں دو مقامات کالنجر نام کے ہیں یعنی ایک تو
وہ جس کو ڈاکٹر ناظم صدیقی اب کوئی متصل راولپنڈی واقعہ ریاست کشمیر بتاتے ہیں
اور دوسرا کالنجر وہ جو ضلع ہزارہ میں ایبٹ آباد اور دریائے سندھ کے درمیان
پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑیوں میں واقعہ ہے (ملاحظہ ہو نقشہ مرتبہ محکمہ سروے گورنمنٹ [illegible])
کالنجر کا ذکر تاریخ ابوالفضل بیہقی میں بھی ہے۔ اس جگہ میں محمود نے اپنے وزیر احمد
ابن حسن میمندی کو برخاست کرنے کے بعد قید رکھا۔ اور یہاں کے راجہ جانکی نے
قنوج جاتے وقت محمودی فوجوں کی رہنمائی کی۔ یہاں تک اور خاص کر ضلع
ہزارہ والے کالنجر تک پہونچنے کے لئے اجمیر سے آنے میں قصبہ راولپنڈی

ضرور راستے میں پڑتا ہے۔ یہ دونوں مقامات حدود دامن کوہ کشمیر میں واقعہ ہیں
ابوریحان البیرونی جلد دوم صفحہ ۸ (ترجمہ ایڈورڈ سچاؤ) پر لکھتا ہے کہ مغربی حدود
کشمیر میں کئی ایک راجہ ہیں اور حدود کشمیر سے ملا ہوا ایک مقام کانیر ہے۔ اسی مورخ نے
صفحہ ۲۰۶ جلد اول (ترجمہ انگریزی) پر لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں مغربی کشمیر کے راجاؤں
میں سے ایک راجہ شیوگن شاہ بھی تھا۔ قصبہ راول پنڈی غالباً راجہ راول کی یادگار
ہے جس کا حال مجمل التاریخ ترجمہ ۱۱۷۶ھ (ایلیٹ ڈاوسن جلد اول صفحہ ۱۰۰) نے
لکھا ہے اور جو ہم کو بتاتی ہے کہ اُس زمانہ میں کشمیر کی حدود ملک سندھ کی حدود سے
ملی ہوئی تھیں ان سب وجوہ سے قیاس ہوسکتا ہے کہ مراۃ مسعودی کا کاہلیر اور ڈاکٹر
ناظم صدیقی اور بیہقی کے کالنجار یا کوٹلی اور ابوریحان البیرونی کا کانیر اور ضلع
ہزارہ کا کالنجر ایک ہی ہیں۔ مگر ہم کو اس قیاس سے بھی اختلاف ہے۔ کالنجر، کوٹلی
تو اس وجہ سے نہیں ہوسکتے کہ محمود کے زمانہ میں بقول بیہقی یہاں راجہ جانکی تھا۔
بقول راجہ ہرگلی (ترجمہ سی دت جلد اول۔ صفحہ ۲۶۴) کالنجر میں علیٰحدہ ہرراج تھا۔
اور مراۃ مسعودی کی روایت ہے کہ کاہلیر میں محمود نے وہاں کے باشندگان کی سرکشی
کی وجہ سے اپنے گورنر مقرر کئے یعنی پہلے ملک جھجو اور بعد کو سالار شاہو کو۔ ناظرین
کہیں گے کہ آخر کبھی اس جغرافیائی اور تاریخی گورکھ دھندے سے نجات ملے گی بھی
یا نہیں، ہم یقین دلاتے ہیں کہ اب ہم صحیح راستہ کے قریب ہیں۔ یہ دونوں کالنجر
اس وجہ سے اور بھی نہیں ہوسکتے کہ یہاں سے ہندوستان اور ملتان آنے کے لئے
دریائے سندھ کو عبور کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی اور وہاں سے سندھ کے مغربی
کنارہ پر جانا اور ملتان کے قرب وجوار میں اُس کو عبور کرنا قطعی غیر ضروری ہو گا۔
بلکہ دریائے جھیلم اور سندھ کے درمیان ہوتے ہوئے کوٹلی کالنجر یا ہزارہ والے
کالنجر سے ملتان میں پہونچنا آسان اور ممکن ہے۔ اتنے کھوج لگانے اور اندھیرے میں

ہاتھ پیر مارنے کے بعد ہم کو موجودہ زمانہ میں ایک مقام کوٹ کائی بالائے سوات میں دریائے سوات اور سندھ کے درمیان پانچ چھ ہزار فٹ بلند پہاڑیوں میں ملتا ہی جو اس زمانہ میں ضرور کشمیر کے دامن کوہ میں تھا (نقشہ مرتبہ محکمہ سروے گورمنٹ ہند) یہ وہی جگہ جس پر ۱۹۳۳ء میں مہمندوں کی بغاوت کی وجہ سے برٹش گورمنٹ نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بم بازی کی ہماری ناچیز رائے میں کوٹ کائی اور کاہلیر ایک ہی جگہ ہیں یہاں کی رعایا اُس وقت بھی متمرد تھی اور اب بھی اپنی آزادی کی دل دادہ ہی۔ یہاں سے چل کر ملتان پہونچنے کے لئے دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑے گا۔ اجمیر سے یہاں آنے کے لئے قصبۂ راول پنڈی ضرور راستہ میں پڑے گا۔ یہاں سے دریائے لوئر کی وادی قریب ہی جس کو محمود نے بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی بحوالہ گرویزی ۱۱۴۰ھ میں یعنی جب کہ سپہ سالار مسعود غازی کی عمر چھ سات سال کی تھی فتح کیا اور جہاں علی بن قدر راجوق اور بقول فرشتہ علی بن قدر سلجوق کو گورنر مقرر کیا اور لوگوں کو جو بدھ مذہب کے تھے اسلام کی تعلیم دینے کی غرض سے عالموں کو مقرر کیا۔ غالباً انھیں لوگوں نے تمردی کی اور جب کہ سپہ سالار مسعود غازی کی عمر دس سال کی تھی اُس تمردی کو دُور کرنے کے لئے سالار شاہو وہاں بھیجے گئے۔ ممکن ہی کہ اس میں یہ مصلحت بھی ہو کہ سالار شاہو بقول ریاض المحبت کے افغان تھے اور کوٹ کائی غیر مسلم افغانوں کی جگہ تھی۔ سلطان محمود کے زیر نگاہ یہ اصول ہو کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے یا سالار شاہو اپنے تدبر اور قابلیت کی وجہ سے اجمیر اور کوٹ کائی کے لئے چُنے گئے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور تاریخی بات زیادہ اہم ہے۔ فرشتہ (ترجمہ انگریزی جلد اول صفحہ ۶۵) نے لکھا ہی کہ محمود کو معلوم ہوا کہ وادی قیرات اور ناردین (صحیح نوم) کے باشندگان بُت پرست تھے۔ یہ ملک ترکستان اور ہندوستان کے درمیان واقع ہی محمود نے اس ملک پر حملہ کیا قیرات کے حاکم نے اطاعت کر لی ناردین کے

ملک میں محمود نے ایک قلعہ بنانے کا حکم دیا اور وہاں بن قدر سلجوقی کو مقرر کیا اور پھر کشمیر کی طرف چل دیا اور لوہکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے محمود لاہور آیا اور یہاں کا راجہ اجمیر بھاگ گیا۔ ہمارے نقطۂ خیال سے اس بیان میں کئی ایک باتیں اہم ہیں۔ اول تو نو وادی قیرات اور نار دین کا ترکستان اور ہندوستان کے درمیان میں واقع ہونا۔ اس لحاظ سے کوٹ کانی کا وقوع صحیح قرار پاتا ہے۔ دوم بن قدر سلجوق یا راجوق کا تقرر جو مراۃ مسعودی میں ملک چھچھو رہ گیا۔ پھر یہاں بھی اجمیر کے وجود کا ثبوت۔ مراۃ مسعودی نے لکھا ہے کہ جب راول کے شیوگن کی حرکت ناشائستہ کی خبر محمود کو پہونچی تو وزیر احمد ابن حسن میمندی کے گھر میں ماتم بپا ہو گیا۔ کیا تعجب ہے کہ اس فرزند کے علیحدگی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو۔ اور مراۃ مسعودی نے اس گتھی پر ایک نئی روشنی ڈالی ہے۔ بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی (صفحہ ۱۳۶) کے امرائے سلطنت کے ساتھ معاملات میں یہ وزیر سخت بہت تھا اور یہ لوگ اُس سے ناراض تھے۔ یہاں تک کہ وہ ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء میں اُس کو برخاست کرانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ وہی سال ہے جب کہ سپہ سالار مسعود غازی کی عمر ۱۲ سال کی تھی اور بقول مراۃ مسعودی اُن کو زہر دینے کی کوشش کی گئی اور اُنھوں نے راجہ شیوگُن کی شکایت محمود سے کی اور راجہ شیوگُن کے بھائی نے سالار مسعود غازی کی شکایت محمود سے وزیر احمد ابن حسن میمندی کے ذریعہ سے کرائی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مراۃ مسعودی کے اس عجیب سے بیان کی تائید کسی دوسری جگہ سے نہیں ہوتی کہ راجہ شیوگُن وزیر ابن حسن میمندی کا سالا تھا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ وزیر نے کسی ہندو عورت سے شادی کر لی ہو۔ آخر ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جھول باوجود آئے دن کی جنگوں کے شروع ہو گیا تھا۔ محمود کی فوج میں ہندو سپاہی اور ہندو افسر تھے جو اُن کے بعد تک اُن کے بیٹے مسعود غزنوی کے یہاں ملازم رہے

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ گزارش ہے۔ مرآۃ مسعودی نے لکھا ہے کہ کاہلیر کا راجہ کلیچند تھا۔ کلیچند تو مہابن ضلع متھرا یوپی کا راجہ تھا جس کو محمود غزنوی نے ہرایا جیسا کہ العتبی وغیرہ نے لکھا ہے یہ دوسری بات ہے کہ کاہلیر میں بھی کوئی دوسرا راجہ اسی نام کا ہو۔ مگر گمان غالب یہی ہے کہ مرآۃ مسعودی کی یہ روایت غلط ہے۔ کیونکہ اگر فرشتہ کی روایت کو صحیح مانا جائے تو کوٹ کائی جدید قلعہ بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر ناظم صدیقی نے وادیِ نور کے حکمراں کا نام نہیں دیا۔

ان سب وجوہ سے ہم مرآۃ مسعودی کے بیانات کو بالکل ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس کتاب نے واقعات میں کچھ اُلٹ پھیر کر دی ہو اور اُس کے کچھ بیانات غلط ہوں تو دیگر بیانات صحیح۔ نو سو برس کے عرصہ میں نام کی تبدیلی تعجبات سے نہیں ہے۔ بوڈھامیوتا سے بدایوں، ڈھلکا سے دہلی، ٹھی رٹ سے میرٹھ، مول استھان سے ملتان، ساکم بھری سے سانبھر، برن سے بلند شہر ہو گئے تو کالنجر یا کوٹ کائی سے کاہلیر رہ جانا کیا مشکل ہے۔

حملۂ سومنات میں شرکت اور جنگی تعلیم

بقول مرآۃ مسعودی کے ان واقعات کے بعد جب سلطان محمود نے سومنات پر چڑھائی کی ٹھانی تو کاہلیر سے سالار شاہو اور سپہ سالار مسعود غازی کو ساتھ چلنے کے لئے طلب کیا۔ مرآۃ مسعودی میں حملۂ سومنات کے جو حالات درج ہیں وہ ہمارے مضمون کی حد سے زیادہ تر باہر ہیں۔ اگرچہ مورخین میں اس حملہ کی تفصیلوں اور راستوں کی بابت بڑا اختلاف ہے۔ مگر ہم اُن کو نظر انداز کرتے ہیں۔ صرف اتنا عرض کریں گے کہ اس بارے میں مرآۃ مسعودی کا بیان وہی ہے جو روضۃ الصفا، تاریخ کامل ابن الاثیر اور بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی کے سبط ابن الجوزی نے دیئے ہیں۔ بعض امور کے متعلق مرآۃ مسعودی نے روضۃ الصفا، نفحات الانس مولانا جامی علیہ الرحمۃ اور فیروز شاہی کے حوالے دیئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرآۃ مسعودی محض تاریخ ملا محمد غزنوی کا خلاصہ ہی نہیں ہے

بلکہ دیگر کتب سے بھی مدد لی ہی اگرچہ حوالے نامکمل ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ جب سلطان محمود سومنات کو روانہ ہوا تو مصالح ملکی کی بنا پر سالار شاہو کو تو واپس کر دیا مگر سپہ سالار مسعود غازی کو ساتھ لے لیا۔ سومنات کی فتح اور آمد و رفت کے سفر میں محمود کو کم و بیش چھ ماہ لگے اور وہ اکتوبر ۲۵ء۱۰ میں چل کر اپریل ۱۰۲۶ء میں داخل غزنین ہوا۔ سپہ سالار مسعود غازی بھی یہیں واپس آئے۔ اس مہم نے سپہ سالار مسعود غازی کو مدرسہ کا کام دیا۔ کیونکہ سپہ سالار موصوف کو محمود کی ماتحتی اور ذاتی نگرانی میں جنگ کی تدابیر، اُس کا نقشہ جمانے، فوجی کارگزاری کی عملی تعلیم حاصل کرنے کا یہ پہلا موقع تھا اور یہ تعلیم آگے چل کر اُن کے بہت کام آئی۔ نہ محض اس وجہ سے کہ اُن کو کئی ایک لڑائیوں میں شریک ہونا پڑا بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کو اپنی ہمت اور قابلیت کے جانچنے کا موقع ملا۔ اور اُس سے فائدہ اُٹھا کر وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے۔

غزنین کا سفر اور وہاں کا قیام

غزنین کے قیام کے سلسلہ میں مرأۃ مسعودی نے ایک قصّہ لکھا ہی جس کی وجہ سے مخالفین نے سپہ سالار موصوف پر بہت کچھ تعصب کا الزام لگایا ہی اُس کے اظہار اور جانچ کی ضرورت ہی۔

مورخین کا قول ہی کہ محمود اپنے ساتھ مندر سومنات سے ایک بُت لے گیا۔ بعض نے لکھا ہی کہ اس کو جامع مسجد کے سامنے ڈال دیا اور بعض نے لکھا کہ محل کے سامنے۔ کچھ مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس کے چار ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا مکہ معظمہ کو بھیجا تاکہ وہاں ڈال دیا جائے اور اُس سے سیڑھی کا کام لیا جائے اور دوسرا مدینہ منورہ (طبقات ناصری ترجمہ صفحہ ۸۲) غرض کہ اسی قسم کے بہت سے قصّے اس بت کی بابت گھڑ لئے گئے ہیں جن کو ڈاکٹر ناظم صدیقی نے اپنی کتاب کے صفحات ۲۱۹ لغایۃ ۲۲۴ پر بڑے معقول اور زبردست دلائل سے غلط ثابت کیا ہی۔

بُت سومنات کا قصّہ

اسی قسم کا ایک قصّہ مرأۃ مسعودی نے لکھا ہی کہ جب بعض

ہندوؤں نے غزنیں پہونچکر محمود سے کہا کہ وہ بت واپس کردے اور اُس کے برابر وزن کا سونا لے لے۔ تو محمود اور اُس کے وزیر تو راضی ہو گئے مگر سپہ سالار مسعود غازی نے کہا کہ ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ قیامت کے روز آپ بجائے بُت شکن کے بُت فروش کہلائیں گے آپ اس مسئلہ کا تصفیہ میرے سپرد کر دیجیئے۔ چنانچہ محمود غزنوی نے یہ معاملہ سپہ سالار مسعود غازی کے سپرد کر دیا۔ سپہ سالار موصوف نے اُس بُت کے ٹکڑے کا چونا بنوایا اور جب ہندو اُن کے پاس گئے تو پان میں رکھکر یہ چونا اُن کو کھلا دیا اور بعد کو بتا دیا۔ یہ بات ہندوؤں کو ناگوار گزری اور وزیر نے بھی محمود سے شکایت کی کہ وہ لڑکے کی باتوں میں آگیا۔ اس بیان کو جانچنے کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ قصّہ کہاں تک قابلِ قیاس ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو ہمارے ابنائے وطن کو ضرور ناگوار ہونا چاہیئے اور اُن کے مذہبی احساس کو ٹھیس لگنا ایک قدرتی فعل ہے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اوّل تو محمود جیسے سمجھدار اور دور اندیش فرماں روا سے بعید ہے کہ وہ تیرہ برس کے لڑکے کے کہنے میں آجاتا۔ دوسرے خود سپہ سالار مسعود کی طبیعت سے بعید تھا کہ وہ ایسا کرتے اور اس کا ثبوت خود مرآۃ مسعودی میں موجود ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ جب سپہ سالار موصوف بہرائچ کے قیام میں سورج کنڈ پر جانے لگے جہاں آفتاب کی پرستش کا بُت تھا تو اُن کے بعض ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ یہاں نماز ہوتی ہے بت توڑ دیا جائے۔ تو سپہ سالار مسعود غازی نے انکار کر دیا اور اُن کو ہدایت کی کہ بُت نہ توڑا جائے اُن کا کوئی حرج نہیں ہے۔ جس شخص کی یہ طبیعت ہو اُس کی بابت کیسے یقین کر لیا جائے کہ وہ کسی بت کا چونا اُس کے پوجنے والوں کو کھلائے گا۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اس حرکت کا کوئی خاص فائدہ متصور نہ ہو۔ اور نہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو اس بُت کے ٹکڑے بھیجنے میں کوئی خاص فائدہ تھا۔ اس قدر دل شکنی کا برتاؤ تعلیم اسلام کے خلاف اور منافی ہے۔ خود حضرت رسول خدا محمد مصطفٰے صلعم نے جو برتاؤ غیر مسلمین کے ساتھ کیا وہ آج تک نہ محض مسلمانوں بلکہ دوسرے مذہب والوں کے لئے بھی سبق سکھانے والا ہے۔ یہودی

سرداروں کے لئے چادر مبارک کا بچھا دینا، نجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی کے صحن میں نماز پڑھنے کی اجازت دینا، ایسی تعلیم ہے کہ جو قیام قیامت تک ایک چمکنے والے ستارہ کی طرح سے روشن رہے گی۔ ایسی حالت میں ایسے شخص سے جس کے دل میں غزوات کا شوق موجیں مار رہا ہو اور جو خدا اور رسول کے احکام کا پابند ہو اس قسم کی حرکت کا سرزد ہونا خلاف قیاس ہے۔ ایک منصف مزاج ہندو مورخ یعنی ویدیا اپنی تاریخ کی جلد سوم صفحہ ۸۷ - ۸۸ پر لکھتے ہیں کہ یہ سب قصے من گھڑت معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے اول فرشتہ نے اپنے نقطۂ خیال سے محمود کی بڑائی دکھانے کے لئے یہ قصہ لکھ دیا اور بعد کو اور لوگوں نے اُس پر حاشیے در حاشیے چڑھائے۔ اسی طریقہ سے ملا محمد غزنوی یا مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے مرآۃ مسعودی میں بھی سپہ سالار موصوف کی بابت بھی ایسا ہی قصہ گھڑ لیا یا نقل کر دیا اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک کی روایت دوسرے سے کسی قدر مختلف۔ اگر یہ تاریخی واقعہ ہوتا تو اُس میں اس قدر اختلاف نہ ہوتا۔

ابن اثیر اور طبقات ناصری نے جو ابتدائی تواریخ ہیں چونا والا قصہ کہیں نہیں لکھا۔ یہ قصہ اس وجہ سے اور بھی غلط ہے کہ احمد ابن حسن میمندی وزیر کو تو سلطان محمود نے سومنات جانے سے قبل ہی ۱۰۲۵ء میں برخاست کر دیا تھا۔ اور اس کی جگہ حسنک میکائیل کو وزیر مقرر کر دیا۔ ایسی حالت میں اپریل ۲۶ھ میں سومنات سے واپسی پر اس قصہ سے احمد ابن حسن میمندی کا تعلق کیسا؟ الغرض ہم کو افسوس ہے کہ مرآۃ مسعودی کی اس غلط روایت کو لیکر بعض مخالفین سپہ سالار مسعود غازی کے خلاف طرح طرح کے بہتان لگاتے ہیں اور اپنے ہم مذہبوں کو اُن کے مزار پر حاضری سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے شک ہر شخص کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا اختیار حاصل ہے مگر سچائی اور ایمانداری کے ساتھ۔

باب چہارم

سپہ سالار مسعود غازی کا غزنی سے ہندوستان میں آنا

مرآت مسعودی کا قول ہے کہ سومنات کے بت کے واقعہ کے بعد سے سپہ سالار مسعود غازی اور وزیر احمد ابن حسن میمندی میں مخالفت بہت زیادہ ہوگئی اور وزیر کو اس قدر صدمہ ہوا کہ امور سلطنت سے اس کی طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ سلطان کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور اس نے دیکھا کہ وزیر کی یہ حالت ہے اور انتظام سلطنت میں خلل پڑتا ہے تو اُس نے سپہ سالار مسعود غازی کو علیحدہ بلاکر کہا کہ وزیر کی یہ حالت ہے وہ مجھ سے بھی رنجیدہ ہے اس کو علیحدہ کرکے حسنک میکائیل کو وزیر مقرر کیا جاوے گا مگر مصلحت ملکی یہ ہے کہ تم تھوڑے دن کے لئے شکار کی غرض سے اپنے والدین کے پاس کاہلیر چلے جاؤ۔ کچھ دن بعد تم کو واپس بلالیا جاوے گا۔ سپہ سالار مسعود غازی نے اپنی ذہانت سے صحیح حالت کو تاڑلیا اور جواب دیا کہ میں کاہلیر میں رہ کر کیا کروں گا۔ اگر شاہی اجازت پاؤں تو ہندوستان میں جاکر غزوات کا کام کروں۔ اور یہ کہہ کر تیاری شروع کردی۔ سلطان محمود سے رخصت چاہی تو اس نے بادل ناخواستہ اجازت دے دی مگر سالار شاہو کو لکھا کہ سپہ سالار ناراض ہوکر آرہے ہیں ان کی دل جوئی کرنا، تھوڑے دن بعد بلالیا جاوے گا۔ محمود نے کچھ ساز و سامان اور کچھ اُمرا اور ترکوں کو اور سپہ سالار کے رشتہ داروں کو اُن کے ساتھ کردیا۔

اس بیان کے جانچنے کی ضرورت ہے نہ محض اس وجہ سے کہ وہ دلچسپ ہے، بلکہ اس سبب سے بھی کہ ان تفصیلات کا ذکر ہم کو بجز مرآت مسعودی کے اور کہیں نہیں ملتا۔ اس بیان میں اور ڈاکٹر ناظم صدیقی میں اس امر پر اختلاف ہے کہ احمد ابن حسن میمندی کب وزارت سے علیحدہ کیا گیا۔

اور حسنک میکائیل جس کا ذکر مرآت مسعودی نے بھی کیا ہے کب وزیر مقرر ہوا - مرآت مسعودی کی روایت کے مطابق تو یہ واقعہ سومنات سے واپسی کے بعد کا ہے اور ڈاکٹر ناظم صدیقی کے مطابق سومنات کے حملہ سے قبل کا - بہرحال مرآت مسعودی کے قول کی یہاں تک تو تائید ہوتی ہے کہ احمد ابن حسن میمندی برخاست ہوا اور ابو علی حسن بن محمد بن عباس جس کو حسنک میکائیل کہتے تھے مقرر ہوا - بیہقی نے بھی لکھا ہے کہ برخاست ہونے کے بعد احمد ابن حسن میمندی کو کالنجر کے قلعہ میں قید کیا گیا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں بہت کچھ سازشیں ابھی سے شروع ہو گئی تھیں - یہ بات تو قیاس کے قابل ہے نہیں کہ محض وزیر کی اور سپہ سالار مسعود غازی کی کشیدگی وزیر کی علحدگی کا سبب ہوئی ہو اور نہ اب تک سپہ سالار مسعود غازی کی ہستی اس درجہ پر پہونچی تھی کہ ان کا غزنی میں رہنا مناسب نہ ہو - اس معاملہ میں ملا محمد غزنوی نے محض سپہ سالار مسعود غازی کی بڑائی دکھانے کے لئے واقعات میں اُلٹ پھیر کر دیا ہے -

ہندوستان آنے کی وجہ

اب سوال ہوگا کہ آخر اور کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟ سنئے ! مرآت مسعودی نے یہ تو لکھا نہیں کہ سپہ سالار مسعود غازی کی عمر اس وقت کیا تھی مگر اُن کی پیدائش کی تاریخ سے سومنات کے حملہ کی تاریخ کا حساب لگایا جائے تو اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۳ - ۱۴ سال کی ہوگی یعنی وہ عمر جب کہ امرار کے لڑکوں میں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں کافی احساس ہر بات کا ہوتا ہے جب کہ ان کا دماغ ماحول سے اثر پذیر ہونے کا مادّہ حاصل کر لیتا ہے اور وہ بلوغ کے دروازہ پر ہوتے ہیں اس عمر میں سپہ سالار غازی کا خود مختارانہ یا نصف آزادانہ طور پر غزنیں سے چل کھڑا ہونا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے خاص کر جب کہ یہ سفر بادشاہ کے اشارے سے تھا ۔ سپہ سالار ہی سے کیا اس عمر میں دنیا کے بہت سے لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے دکھائے ہیں خود محمود کی زندگی میں یہ کارنامہ موجود ہے - یمنی العتبی اور جامع الحکایات عوفی نے لکھا ہے کہ جب محمود کے باپ سبکتگین اور پنجاب کے ہندوؤں شاہی خاندان کے راجہ

اجے پال میں لڑائی تھی تو سبکتگین کو ایک موقعہ پر ذرا سی وقت پیش آئی - محمود نے جن کی عمر اس وقت صرف ۱۴ سال کی تھی اپنے باپ کو ایک خاص طریقہ سے حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ مشورہ مانا گیا اور خود محمود نے اسی طریقہ سے حملہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ جنگ پانی پت میں اکبر اعظم کی عمر کونسی زیادہ تھی جس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا اور حکومت کو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کر دیا۔ سکندر لودی جب بہلول کے انتقال کے بعد تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی - الغرض ایسی بہت سی مثالیں تواریخ میں موجود ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کی کم عمری غزوات کے مانع نہ تھی -

حملہ سومنات کا سپہ سالار مسعود غازی کی طبیعت پر اثر

جب یہ مسئلہ حل ہو گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان آنے کا خیال کیوں پیدا ہوا - ہم بتا چکے ہیں کہ سپہ سالار موصوف کو سب سے اول قصبہ راول کے راجہ شیوگن کے خلاف کامیابی حاصل ہو چکی تھی - پھر وہ سلطان محمود کے ساتھ سومنات کے حملے میں اور واپسی کے سفر میں شریک تھے جس نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور تھوڑا بہت تجربہ کار بنا دیا - انھوں نے راستوں کی مصیبتیں جھیل لیں اور سخت لڑائیوں کا ڈر ان کے دل سے نکل گیا - والدین سے علٰحدہ رہنے کی عادت ہو گئی - اور سب سے بڑھ چڑھ کر یہ کہ سومنات کی فتح اور ترویج اسلام پر محمود کی جو تعریفیں ہوئی ہوں گی وہ سب انھوں نے سُنی ہوں گی اس لئے اسی قسم کی تعریفیں حاصل کرنے کی امنگ اُن کے نوجوان دل و دماغ میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی -
آج کل کے نوجوانوں میں بھی تو اسی قسم کی اُمنگیں اٹھتی ہیں جو ملک بھر کا یا دنیا بھر کا سفر محض بائیسکل پر یا سات سمندر کا سفر ہوائی جہاز پر کرانے کی ذمہ دار ہوتی ہیں - اس طرف تو یہ اٹھتی امنگیں اور اُدھر درباری سازشوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا -

محمودی خاندان اور دربار کی سازشیں

محمود کے آخر زمانہ میں یعنی اس کے انتقال سے پانچ چھ سال قبل سازشیں اور ایک

دوسرے کی مخالفتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ کسی ممتاز شخص کو جس کا تعلق دربار شاہی سے تھا ان سے بچنا ناممکن تھا۔ اور بالآخر محمود کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان سازشوں نے ان کے دونوں بیٹوں کو لڑا کر رنگ دکھایا۔ چنانچہ بیہقی نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے کہ محمود کے زمانہ میں دو پارٹیاں تھیں جن میں سے ایک کو محمودی یا پدری کہتے تھے اور دوسری کو مسعودی۔ سلطان محمود نے اپنے بیٹے مسعود سے ناراض ہو کر کچھ روز کے لئے اس کو ملتان کے قلعہ میں قید کر ہی دیا تھا۔

بیہقی نے صفحہ ۱۳۶ پر لکھا ہے کہ محمود کی بہن حرۂ ختلی یعنی مسعود کی پھوپی جن کی بابت ہم نے اوپر خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نام ستر معلےٰ سے بہ لحاظ تجنیس خطی ملتا جلتا ہے مسعود غزنوی سے جلتی تھیں اور سلطان محمود سے خفیہ طور پر اس کے اس بیٹے کی برائیاں کرتی رہتی تھیں۔ اگر یہی بی بی ستر معلےٰ تھیں تو یقیناً مسعود کو سپہ سالار مسعود غازی سے ناراضی اور کشیدگی کی کافی وجہ تھی اور اگر یہ بی بی ستر معلےٰ نہ تھیں تو بھی اس روایت سے محمودی خاندان کے آپس کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے کہ محمود کے بعد مسعود نے سب سے اول اپنے بھائی محمد کو قید کر کے اندھا کرا دیا۔ اور پھر محمودی پارٹی کے آدمیوں کو چن چن کر سولی پر چڑھایا۔ اپنے باپ کے تیسرے وزیر حسنک میکائیل کو قرامطی ہونے کا پرانا الزام لگا کر پھانسی دے دی اور سپہ سالار کے خاندان کے مخالف پہلے وزیر احمد بن حسن میمندی کو قید سے نکال کر دوبارہ وزیر بنایا۔

محمودی پارٹی مسعودی پارٹی

محمودی زمانہ کے سپہ سالار افواج ہند اریارق سالار کو بہانہ سے بلا کر اول خوب خاطر تواضع کی اور پھر سولی پر چڑھا دیا۔

مسعودی پارٹی کے آدمی اسفتگین سالار کو احمد بن حسن میمندی کے مشورہ سے ہندوستان سے بلا لیا مگر محمودی پارٹی والوں نے بادشاہ سے اس کی برائیاں کرتے کرتے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ مسعود غزنوی نے اپنے چچا یوسف کو بھی سلامت

نہ چھوڑا۔ قصہ مختصر بیہقی نے اس حالت کا نقشہ احمد ابن حسن میمندی کی زبانی یوں کھینچا ہے
"این گرگ پیر (یعنی احمد ابن حسن)، گفت قومے ساختہ اند از محمودی و مسعودی و باغراض
خویش مشغول اند و ذکرہ و غیرہ خیر کناد" (بیہقی صفحات ۱۳۶ - ۲۶۲ - ۲۸۶) ایسی حالت
میں کیا تعجب ہے کہ محمود نے سپہ سالار مسعود غازی کو ہندوستان بھیج دیا ہو اور غزوات کی
اجازت دے دی یا انھوں نے خود ہی اس تماشے سے بچنے کے لئے ہندوستان چلے
آنے کی خواہش ظاہر کی ہو۔

سالار کے فرائض

یہاں ایک اور بات بھی قابل گزارش ہے۔ ویدیا اپنی تاریخ
کی جلد سوم میں خیال ظاہر کرتے ہیں کہ محمود نے قنوج ایک
فوجی دستہ اس غرض سے تعینات کیا تھا کہ وہ راجہ قنوج سے خراج وصول کر کے
غزنیں کو بھیجتا رہے۔

"ترشک ڈانڈ"

اس کی تائید دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے اس ٹیکس کو ہندوستانی
ترشک ڈانڈ یعنی ترکوں کا تاوان کہتے تھے اور یہ تاوان ایک عرصہ
تک بیچاری رعایا سے قنوج کے راجہ لیتے رہے حالاں کہ غزنوی حکومت کی کمزوری کے
باعث وہ ٹیکس راجاؤں کی جیب میں جاتا رہا۔ جیسا کہ اُن کتبہ جات سے ثابت ہے جو قنوج
کے راجاؤں کے زمانہ کے سمت ۱۱۷۱ بکرمی (سنہ ۱۵-۱۱۱۴ء) وسمت ۱۲۳۳ بکرمی (سنہ ۷۷-۱۱۷۶ء)
میں اور رکموئی ضلع بنارس میں سنہ ۱۸۹۲ء میں برآمد ہوئے اور جو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ
سے دی ہوئی جاگیریں ترشک ڈانڈ سے مستثنیٰ رہیں گی (ایپی گریفیا انڈکا جلد ۴ صفحہ ۹۹)
بیہقی (صفحہ ۳۲۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ سالار کے فرائض میں سے غزوات کے علاوہ
ٹیکس وصول کرنا بھی تھا۔ کیا تعجب ہے کہ محمود نے یہ خدمت بھی سپہ سالار موصوف کے
سپرد کر دی ہو۔ اگرچہ اس کی سپردگی کا کوئی بیّن ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔ اب قدرتاً
یہ سوال ہوگا کہ یہ تو سب کچھ صحیح مگر محمود غزنوی کے بعد سالار شاہ اور سپہ سالار مسعود غازی

ہندوستان میں غزوات کیسے کرتے رہے کیا مسعود غزنوی کی طرف سے ان کو اجازت تھی یا ہندوستان میں ان کا قیام سلطان مسعود کی مرضی کے خلاف تھا اور خلاف تھا تو سلطان مسعود نے ان کو واپس کیوں نہیں بلا لیا۔ یا سالار شاہو اور سپہ سالار موصوف نے خود پھر غزنیں کی طرف رخ کیوں نہ کیا؟

مسعود غزنوی سے ہندستانی ترکوں کی بغاوت

تاریخ کامل ابن اثیر (ایلیٹ ڈاوسن جلد دوم صفحہ ۲۵) کا بیان ہے کہ محمود کے انتقال کے بعد علاوہ جنرل احمد نیال تگین کے جس نے بنارس پر حملہ اور جو فوجی ترک ہندوستان میں تھے اُنھوں نے سلطان مسعود سے بغاوت کردی۔ اور یہ کہ ان میں سے بعض خود مختار بن گئے۔ سالار شاہو اور سپہ سالار مسعود غازی ترک تو نہ تھے مگر فوجی افسر ہونے کی حیثیت سے ان کا شمار بھی انھیں میں تھا۔ وہ اس ہوا سے کب بچ سکتے تھے اور خاص کر اُن سازشوں کی وجہ سے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ بالآخر احمد نیال تگین نے بھی بنارس سے واپسی کے بعد بغاوت کی اور ایک ہندو جنرل تلک اس کی گرفتاری کے لئے تعینات ہوا۔ ۴۳۳ھ ۱۰۴۲ء میں مسعود کو خود ہندوستان اسی وجہ سے آنا پڑا کہ علاوہ غزوہ کے وہ ان باغی ترکوں کو ہندوستان سے نکال دے۔ اگرچہ وہ ہانسی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان باغی اور خود مختاروں سے اشارہ ابن اثیر کا غالبًا سالار شاہو اور سپہ سالار موصوف سے ہے اب رہا غزنیں کی طرف واپسی کا خیال تو اس کے عمل میں لانے کی فرصت موت نے سالار شاہو کو اور شہادت نے سپہ سالار مسعود غازی کو کب دی۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تیرہ چودہ سال کے نوجوان کے دماغ میں تبلیغ کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ حملہ سومنات کے وقت محمود کی صحبت اور اس کے نتائج نے اُن کے دماغ پر کیا اثر ڈالا ہوگا۔ تبلیغ تو مذہبًا ہر مسلمان کی گھٹی میں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض مسلمان

کو مذہب میں غلو نہ ہونے کی وجہ سے اور بعض کو دنیاوی ضروریات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ ہو۔ مسلمانوں پر کیا منحصر ہے۔ پُرامن طریقہ سے تبلیغ دوسرے مذہبوں میں بھی جائز اور ضروری ہے اور دوسرے مذہب والے بھی اس کو کرتے ہیں خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، بوڑھے ہوں یا جوان۔

تبلیغ

یہ قصہ تو زمانۂ دراز سے چلا آرہا ہے۔ کیا حضرت مسیح نے دوڈیڑھ ہزار سال قبل وسط ایشیا سے جو پُرانی تہذیب کا گہوارہ تھا، آرین نسل کے لوگوں نے شمالی مغربی دروں اور گنگا کی وادی سے بھارت ورش میں آکر ایک نئے مذہب کا پرچار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اصل دراوڑی اور ان کا قدیم دھرم صرف کہیں کہیں نظر آتا ہے یہ تبلیغ کے اور پُرزور تبلیغ کے نتائج نہ تھے تو اور کیا تھا۔ اس کے بعد اس تماشاگاہ عالم پر ایک نیا پردہ گرتا ہے۔ حضرت مسیح سے ساڑھے چار سو سال قبل ویدک دھرم کی جڑیں جین مت اور بدھ مت کے ہاتھوں ایسی ہلتی ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں از سر نو ان کو درست کرنا پڑتا ہے۔ اسی درمیان میں یہ سین بھی بدلتا ہے اور عیسائیت آکر دنیا میں پھیلنے کی کوشش کرتی ہے۔ عیسائی کی شروع سے چھ سو برس بعد اسلام کو فروغ ہوتا ہے اور وہ ہر مسلمان کے لئے تبلیغ کو ضروری قرار دیتا ہے اور نصف یورپ پر اپنا اثر کرلیتا ہے۔ اس حالت میں محمودی خاندان یا مابعد کے بادشاہوں یا سپہ سالار مسعود غازی میں تبلیغ کا خیال کچھ اچنبھے کی بات نہیں ہے ممکن ہے کہ قارئین کرام خیال کریں کہ ہم اپنے نفس مضمون سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہم معافی کے خواستگار ہوتے ہوئے عرض کریں گے کہ

فلسفۂ تبلیغ

فلسفۂ تبلیغ سے سپہ سالار مسعود غازی کی زندگی کو بڑا لگاؤ تھا اور اُن کی زندگی کے حالات کو ٹھیک طور سے سمجھنے کے لئے تبلیغ کے مسئلہ کو سمجھنا ہمارے نقطۂ خیال سے بڑا ضروری ہے۔ اس لئے ہم یہاں اس سلسلہ میں ناظرین کا تھوڑا سا وقت اور لیں گے۔ اب یہ تو ہم نے دکھا دیا کہ تبلیغ ہر مذہب میں جائز ہے، ہوئی، ہو رہی ہے

اور ہوتی رہے گی۔ مگر یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ کس قسم کی۔ بعض دفعہ اسلام پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بزور شمشیر پھیلا۔ ہم اس سلسلہ میں صرف اس قدر عرض کریں گے جب حضرت رسول خدا نے تبلیغ شروع کی تو وہ تنِ تنہا تھے کیا حضرات خلفاء راشدین کو مسلمان کرنے کے لئے کوئی تلوار اٹھائی گئی تھی؟ پھر یہ تو قرآن مجید نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی مذہب میں کوئی کراہت اور جبر نہیں ہونا چاہئے۔ اگر دو چار آدمی اس زریں اصول سے ہٹ جائیں خواہ وہ کسی دین کے ہوں (ہندو یا مسلمان یا عیسائی) تو اس سے مذہب کے قاعدے اور اصول میں فرق نہیں آسکتا۔ اور نہ رواداری کا اچھا قاعدہ ٹوٹ سکتا ہے۔ اگر ہلاکو خاں یا سلجوقیوں کی تیز تلواروں نے ایرانی تہذیب کا قلع قمع کیا تو اس کی وجہ سے ہم ترکوں کو بہ حیثیت قوم کے برا کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں اگر سکھوں نے اور مرہٹوں نے بہت سے مسلمانوں کی جانیں لیں تو ہم سکھ یا برہمن دھرم کو برا کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر عیسائیوں نے اندلس میں مسلمانوں پر ستم توڑے تو اس سے ہر عیسائی برا نہیں ہو سکتا۔ اسی طریقہ سے ہندستان میں بھی ہندو مسلم آویزش سے ان مذہبوں کی برائی ثابت نہیں ہوتی۔ ان باتوں کا تعلق جائز تبلیغ سے نہیں ہے۔ بلکہ انسانی نفس، انسانی خواہشات لالچ اور طمع سے ہے۔ ایسی حالت میں محض تبلیغ کی وجہ سے سپہ سالار مسعود غازی پر کوئی دھبہ نہیں آسکتا۔ ہاں اندفاعی جنگ تقاضائے بشریت ہی خواہ وہ بشر کسی دین اور ملت کا ہو۔ آج کل بھی اگر ایک ہندستان میں ایک طرف تبلیغ ہے تو دوسری طرف شدھی۔ اور یہی قصہ اس زمانہ میں تھا۔ اگرچہ یہ دوسری بات ہی کہ ان تحریکوں کے اظہار میں کبھی کبھی زیادتی بھی ہو جاتی تھی۔

کیا سپہ سالار مسعود کے آمد کی غرض پولیٹیکل تھی

اس طویل بحث کے بعد ہم عرض کریں گے کہ دو چار اصحاب نے ہم سے فرمایا کہ سپہ سالار مسعود غازی غزوات کی غرض سے نہیں بلکہ اُن کی ہندستان میں آنے کی غرض پولیٹیکل تھی

یعنی دھن دولت اور ملک گیری کی ہوس، یا جاہ و منزلت کا شوق۔ ہم کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ سپہ سالار مسعود غازی کی زندگی میں اس خیال کی بہت اچھی تردید ہم کو ملتی ہے۔ مرآت مسعودی کا بیان ہے کہ بہرائچ میں شہادت اور جنگ سے کچھ قبل ان کے بعض دنیا دار ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ جب وہ ہندستان کے ایسے گوشہ میں آ گئے کہ جہاں پہونچنا مشکل ہے تو ان کو خود مختار فرماں روا بن جانا چاہیئے۔ سپہ سالار موصوف نے جواب دیا کہ سلطنت اور حکومت بادشاہ کو سلامت رہے ان کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ لوگوں تک خدا کا پیغام پہونچا دیں۔

سپہ سالار مسعود غازی نے بادشاہت قائم نہیں کی اور نہ کبھی لوٹ مار کی

حکومت غزنین کی دوری کی وجہ سے ان کو موقعہ حاصل تھا کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیتے مگر انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ان کا پر امن طریقہ اسی سے ثابت ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو پکڑ بلانے کے لئے کبھی کوئی تعینات نہیں ہوا۔ نہ مرآت مسعودی یا کسی اور تاریخ نے ظاہر کیا کہ احمد نیال تگین کی طرح سے انھوں نے کوئی شہر لوٹا ہو۔ بلکہ بقول مرآت مسعودی کے بہرائچ میں جنگ سے قبل جب مقامی راجاؤں نے ان سے چلے جانے کے لئے اصرار کیا تو انھوں نے یہی جواب دیا کہ وہ تھوڑے دن کے لئے شکار کھیلنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اغراض پولیٹیکل تھیں۔ البتہ اگر محمود نے ان کے سپرد ٹیکس وصول کرنے کا کام بھی کیا تھا جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو آپ کہہ سکیں گے کہ وہ محض غزوات کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ محمود کی حکومت نے ان کے سپرد اک اور کام بھی کر دیا تھا۔

سپہ سالار مسعود غازی کے پاس فوج اور اخراجات کے لئے روپیہ کہاں سے آیا

اب یہاں سوال پیدا ہوگا کہ سپہ سالار مسعود غازی کو اتنی فوج اور اتنا خزانہ کہاں سے ملے جو وہ ہندستان میں غزوات کر سکے۔ مرآت مسعودی

نے تو سپہ سالار موصوف کی فوج کی تعداد لاکھوں بتاتی ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ مبالغہ ہے
نہ ان کے پاس کوئی ملک تھا نہ ایسی دولت اور نہ لوٹ مار کہ لاکھوں کی فوج قایم رکھ سکتے
البتہ کچھ لوگ ان کے ساتھ غزنیں سے آئے اور کچھ اُن کے والد نے کاہلر سے دئے جیساکہ
مرآت مسعودی سے ثابت ہے اور کچھ مقامی مسلمان ان کو ہر جگہ مل جاتے تھے جیساکہ محمود
کو قنوج کے حملے کے وقت بیس ہزار رضاکار مل گئے تھے ۔ سب سے بڑا ثبوت اس امر
کا کہ ان کے پاس زیادہ فوج نہ تھی اور وہ صرف خدا کے بھروسے اور اپنے عزم بالجزم
کی وجہ سے چل پڑے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ راجہ کی مخالفت کی وجہ سے
وہ دہلی، بدایوں میں نہ ٹھر سکے اور بہرائچ میں ان کو فیصلہ کن شکست اُٹھانا پڑی ۔ اگر
ان کے پاس فوج ہوتی تو شاید بہرائچ میں جنگ کا نتیجہ دوسرا ہوتا ۔ وہ آئے تو سلطان محمود
کی اجازت سے اور کچھ فوج ساتھ لائے مگر سلطان مسعود سے ان کو کوئی مدد نہ ملی اس سے ثابت
ہے کہ مرکزی حکومت سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا تھا ۔ اب رہا آمدنی اور روپیہ کا سوال، یہ
کوئی مشکل سوال نہیں ہے ۔ ان کے والد بزرگوار سلطان محمود کے افسروں میں سے تھے کچھ
اُن سے ملا اور کچھ سلطان سے ۔ پھر ان کی زندگی سیدھی سادی تھی بادشاہ زادوں
کے سے خرچ نہ تھے کچھ تحفے تحائف یقیناً ملے جیساکہ مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ راجہ
میرٹھ اور راجہ قنوج نے ان کو نذر میں بہت کچھ دیا اور ان کے معاوضہ میں سپہ سالار موصوف
نے ان ہر دو راجاؤں سے کچھ تعارض نہیں کیا ۔ مرآت مسعودی نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اُن
کو ایک دفینہ مل گیا تھا جو سب فوج پر خرچ کر دیا مگر چوں کہ یہ ایک افسانہ آمیز قصّہ ہے
اس لئے ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا ۔ محمود کی زندگی تک اُن کو کچھ نہ کچھ مرکزی حکومت سے ضرور ملتا
رہا ہوگا ۔ اس قدر بحث کے بعد اب ہم سپہ سالار موصوف کے ساتھ سفر شروع کر کے دکھائیں گے کہ وہ
کہاں کہاں گئے اور کیا کیا ۔

غزنیں سے چل کر سپہ سالار مسعود اول کاہلر میں آئے

سپہ سالار مسعود غزنیں سے
چل کر اول کاہلر میں اپنے والدین

کے پاس آئے۔ یہ ایک فطری امر تھا اور سلطان محمود کی ہدایت بھی یہی تھی۔ درمیانی راستہ کی تفصیل مرآت مسعودی نے قطعی نظرانداز کردی ہے ورنہ آج کل کے جغرافیہ پر بہت کچھ روشنی پڑتی۔ اگر کاہر کوٹ کاہی تھا جیسا کہ ہم نے خیال ظاہر کیا ہے تو وہ غزنیں سے چل کر کابل ہوتے ہوئے براہ جلال آباد کوٹ کاہی کابل پہونچے ہونگے۔

غزنیں سے کاہیر کا راستہ

موجودہ نقشوں کی رو سے یہ سفر تین سو میل سے کچھ اوپر ہے اور دریاے کابل، کنار اور سوات اُن کو پار کرنے پڑے ہوں گے اور کئی ایک پہاڑی دروں سے نکلنا پڑا ہوگا۔ راستہ کٹھن اور خطرناک ہے جس سے سپہ سالار موصوف کی اس کم عمری میں ہمت اور استقلال پر روشنی پڑتی ہے۔ کاہیر پہونچ کر کچھ دن قیام کیا جب سپہ سالار موصوف والد بزرگوار کو غزوات کے ارادہ سے مطلع کیا تو انھوں نے روکنا چاہا۔ مگر سپہ سالار موصوف جب ایک مرتبہ دل میں ٹھان چکے تو وہ اُس سے نہ ہٹے۔ ادھر تو فطرت نے زور لگایا کہ بیٹے کو جدا نہ ہونے دیا جائے اُدھر محمود نے ضرور سالار ستاہو کو اُن حالات سے مطلع کردیا جس میں سپہ سالار غازی نے غزنیں چھوڑا اس لئے سالار ستاہو کا اصرار ایک قدرتی امر تھا۔ مگر ہونے والی بات کیسے اَن ہونی ہوسکتی ہے بالآخر سالار ستاہو نے بھی سپہ سالار مسعود کو غزوات کی اجازت دی اور تھوڑی سی جمعیت ساتھ کردی۔

کاہیر سے چل کر سپہ سالار موصوف دریائے سندھ کے کنارے آئے۔ دریائے سندھ کے دلچسپ مگر مشکل راستے کو بھی مرآت مسعودی نے ترک کردیا ہے اور اس کی تفصیلیں ہم کو نہیں معلوم۔ مگر دریائے سندھ کے داہنے ہاتھ کے یا مغربی کنارے یہ ہوتے ہوئے اور نوشہرہ کے آس پاس دریائے کابل کو عبور کرکے اور دریائے کسرم کو پار کرکے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قرب و جوار میں ہوتے ہوئے ملتان کے محاذ میں پہونچے۔

کاہیر سے شیوپور اور اس کا راستہ

یہ سفر بھی تین چار سو میل سے کم نہیں ہے

یہاں پہونچ کر سپہ سالار موصوف نے چند سرداروں کی ماتحتی میں ایک فوجی دستہ شیوپور یا سیت پور بھیجا - یہاں کا راجہ ڈر کے مارے بھاگ گیا - اور یہ مقام سپہ سالار موصوف کے مجاہدین کے ہاتھ لگا - مگر سرداران فوج اس کے فتح کرنے کے بعد سپہ سالار موصوف سے آملے - اس راستہ کے اختیار کرنے سے بھی خیال ہوتا ہے کہ کاہیر کوٹ کانگی کا نام تھا ورنہ کالنجر جواب کوتلی ہے یا کالنجر ضلع ہزارہ ہوتا تو دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان پہونچنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس کے بائیں ہاتھ پر ہوتے ہوئے اور چند چھوٹے چھوٹے ندی نالے عبور کر کے ملتان پہونچ جاتے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ملتان تک جانے کی کیا ضرورت تھی - اٹک کے قریب دریائے سندھ عبور کر کے سپہ سالار موصوف کوٹکائی سے چل کر جہلم اور سندھ ندیوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی ملتان پہونچ سکتے تھے - ممکن ہے کہ اس طویل راستہ میں شکار اور تبلیغ کی مصلحتیں شامل ہوں - دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ملتان تک دریائے سندھ اپنی تیزی کی وجہ سے خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور ملتان کے نیچے اس کا خطرہ اور تیزی اس وجہ سے کم ہو جاتے ہیں کہ وہ پھیل جاتا ہے راجہ ارجن کے بارے میں تو ہم کو پتہ لگ نہیں سکا مگر شیوپور (SHEO PORE) یا سیت پور (SIT PORE) کے متعلق بڑی دلچسپ بحث ہے جس سے یقینی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرآت مسعودی کا یہ نام فرضی نہیں ہے یہ جگہہ ملتان سے مشرق میں اس جگہہ کے قریب ہے جہاں دریائے چناب اور جہلم، سندھ میں ملتے ہیں - مرآت مسعودی کے مختلف نسخوں میں یہ نام مختلف طریقہ سے لکھا ہے - شیوپور، ستی پور سیت پور، سر ہنری الیٹ کے سامنے مرآت مسعودی کے جو نسخے تھے ان میں سہور شور درج تھا (الیٹ ڈاوسن جلد دوم صفحہ ۵۲۹) سر ہنری الیٹ نے جلد اول کے صفحات ۵۵۰ لغایۃ ۵۵۲ پر جو اقتباس البیرونی کی کتاب کا دیا ہے اس میں لکھا ہے کہ ہنود کے اعتقاد کے مطابق دریائے گنگا کی سات شاخیں ہیں ان میں ایک دریائے سیت بھی ہے - اس بارے میں

سب سے اچھی شہادت ابوریحان البیرونی کی ہے جو کہتا ہے کہ جس حصّۂ ملک میں دریائے سند بہتا ہے وہاں ایک شہر شیوپور بھی ہے۔ بقول سر ہنری الیٹ کے البیرونی کے نسخوں میں بھی اختلاف ہے۔ ایک نے سیپور، دوسرے نے سیور تیسرے نے سیور، چوتھے نے سنور اور پانچویں نے سور لکھا ہے۔ یہ سب غلط کتابت کے کرشمے ہیں۔ ورنہ صحیح شیوپور ہے (البیرونی ترجمہ جلد اول صفحہ ۲۶۱)۔

شہر ملتان، وہاں کا راجہ اور اس سے جنگ

شیوپور سے چل کر سپہ سالار مسعود غازی ملتان میں آئے۔ مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے دوسرے حملے کی وجہ سے یہ اجڑ گیا تھا اور یہاں کا راجہ اننگ پال اوچھ میں چلا گیا۔ جب سپہ سالار مسعود غازی اوچھ کی طرف بڑھے تو راجہ نے روکا اور اس پر جنگ ہوئی۔ کامیابی کا سہرا سپہ سالار موصوف کے سر پر رہا۔ اتنے میں برسات سر پر آگئی اور سپہ سالار موصوف کو چار ماہ تک ملتان میں قیام کرنا پڑا۔ اور اس نواح میں سال بھر صرف ہو گیا۔ یہاں سے سپہ سالار موصوف اجودھن آئے اور چوں کہ آب و ہوا اچھی تھی اور شکار بھی خوب تھا، یہاں اتنا عرصہ لگ گیا کہ دوسری برسات سر پر آگئی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ غزنیں سے چلنے کے بعد یہاں تک کم و بیش دو سال صرف ہوئے۔ اس حساب سے یہ واقعات ۱۰۳۰ء کے آس پاس کے ہیں جب سپہ سالار مسعود غازی کی عمر پندرہ سال کے قریب تھی۔ یا یوں کہئے کہ سلطان محمود غزنوی کے انتقال سے کچھ ہی زمانہ قبل کے یہ واقعات ہیں۔ اب ذرا ملتان کے قصّے کو جانچنا چاہیے یہ بہت پرانی جگہ ہے اصلی نام اس کا مول استھان تھا۔ ساتویں صدی ہجری کے عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ بقول کتاب نزہتہ المشتاق ادریسی کے یہاں پر چھٹی صدی ہجری میں بھی یا بالفاظ دیگر محمود غزنوی کے ڈیڑھ سو سال بعد تک پرانے مندر موجود تھے۔ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود نے یہاں کے

مندروں کو توڑا نہیں بلکہ وہ بدستور ہندوں کے قبضہ میں رہے۔ البتہ خراج وصول کیا۔ یہ جگہ ہندو دھرم کی پرستش گاہ ہونے کی وجہ سے مشہور تھی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں میں یہاں قرامطہ اور غیر قرامطہ کا سوال تھا۔ اس لئے تعجب نہیں ہے کہ تبلیغ کے لحاظ سے سپہ سالار مسعود غازی نے یہاں آنا ضروری سمجھا ہو۔ اس پر پہلا حملہ سلطان محمود نے ۳۹۶ھ ۱۰۰۶ء میں کیا تھا مگر الک خاں کے حملے کی وجہ سے قرب وجوار کے حصوں کو غیر مفتوح چھوڑ کر محمود کو جانا پڑا اور وہ دوبارہ ۴۰۱ھ ۱۰۱۰ء میں یہاں آیا اور یہاں کے قرامطی والی ابو الفتح داؤد کو قید کیا اور ہزاروں قرامطی تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے (ڈاکٹر ناظم صدیقی صفحہ ۹۹) ایسی حالت میں مرآت مسعودی کا یہ بیان کہ ملتان محمود کے دوسرے حملے کی وجہ سے اوجڑ ہو گیا تھا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

راجہ اننگ پال

البتہ سپہ سالار موصوف کے حملے کے وقت اننگ پال کا یہاں راجہ ہونا سمجھ میں نہیں آیا اور مرآت مسعودی کا یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ دقت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی کہ اننگ پال نام کے کئی ایک راجہ تھے دہلی کا راجہ اننگ پال تو مرضرور تھا مگر یہ امر خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے کہ محمود کی فتح کے بیس برس بعد ہی ملتان دوبارہ ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا ہو اور راجۂ دہلی کے ملک کی حدود میں ملتان بھی شامل ہو۔ جامع التاریخ رشید الدین کے اقتباس کا ترجمہ دیتے ہوئے سر ہنری الیٹ نے جلد اول کے صفحہ ۶۱ پر دکھایا ہو کہ اس زمانہ میں ملتان دہلی کے ماتحت تھا۔ اور شاید اس وجہ سے مرآت مسعودی نے دہلی کے راجہ اننگ پال کو ملتان اور اوچھ کا راجہ قرار دیا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ سر ہنری الیٹ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ رشید الدین نے یہ بات غالباً اپنے دماغ سے گھڑ لی ہے کیوں کہ ابو ریحان البیرونی کی کتاب تحقیق ما للہند میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ملتان مسلمانوں کے قبضہ میں کب تک رہا اگرچہ صوبہ سندھ کی بابت کہ جس میں

ملتان واقع ہے ہمارے پاس اچھی شہادتیں موجود ہیں۔

سندھ غزنویوں کے قبضہ میں کب تک رہا

تاریخ معصومی (الیٹ ڈاؤسن جلد اول صفحہ ۲۱۵) نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی نے ملتان فتح کرنے کے بعد سندھ پر قبضہ کر لیا مگر عبدالرشید بن مسعود غزنوی بادشاہ کے زمانہ میں ۱۰۵۱ء میں سندھ میں دیگر خود مختار ریاستیں قائم ہونے لگیں۔ تحفۃ الکرام تاریخ سندھ (مصنفہ ۱۷۷۵ء) کی بھی یہی روایت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بقول ہمعصر مورخ بیہقی کے سندھ محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے قبضہ میں تھا (صفحہ ۵۰۱) گزیٹیر صوبہ سندھ مصنفہ اے ڈبلیو ہیوز میں بھی ہم کو ملتان کے سلسلے میں راجہ اننگ پال کا نام کہیں نہیں ملا۔ گزیٹیر سے اس قدر ضرور معلوم ہوا کہ سلطان محمود نے ملتان اور اوچھ کو فتح کرنے کے بعد اپنے وزیر عبدالرزاق کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ اور اس نے ۱۰۲۶ء میں سندھ فتح کیا مگر ۴۲۳ھ ۱۰۳۲ء میں یہاں خاندان غزنوی کی حکومت برائے نام رہ گئی یہاں تک کہ ۴۴۳ھ ۱۰۵۱ء میں سندھ بالکل خود مختار ہو گیا۔ ملتان پر سپہ سالار موصوف کا حملہ ۱۰۳۲ء کے آس پاس ہی ہوا۔ اس لئے ممکن ہے اگرچہ اغلب نہیں ہے کہ یہاں اس زمانہ میں بقول مرآت مسعودی کے کوئی ہندو راجہ ہو۔ یا مرآت مسعودی نے ملتان او دہلی کے راجاؤں کو مخلوط کر دیا ہو۔ اننگ پال نام کے اور بھی راجہ تھے۔ اسی سے ملتا جلتا انند پال ولد جے پال ہندو شاہی راجہ پنجاب تھا مگر اس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی کے وہ ۴۰۱ھ ۱۰۱۰ء میں یعنی سپہ سالار موصوف کی پیدائش سے چار سال قبل فوت ہو چکا تھا ہندو شاہی خاندان کے راجگان میں ایک شخص اننگ پال نامی تھا۔ جو بقول ویدیا کے محمود کے ہاتھوں ترلوچن پال کی شکست کے بعد کشمیر کے راجہ اننت راج یا اس کے باپ سنگرام کے پاس چلا آیا تھا اور ترکوں سے برابر لڑتا رہا جیسا کہ راج ترنگی مصنفہ کلہانا پنڈت نے بھی لکھا ہے مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں کہ وہ ملتان کا راجہ بن بیٹھا تھا۔ مرآت مسعودی کی روداد

کی بابت صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیاس کے خلاف ہے۔

ملتان سے اوچہ اور وہاں سے اجودھن ہوتے ہوئے دہلی میں آنا اور جنگ کرنا

اوچہ اور ملتان کا ایک عرصہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس نام کے دو مقام ہیں ایک ملتان سے شمال میں اور دوسرا جنوب میں۔ مسلمان مورخین نے اس کا نام آجا بھی لکھا ہے مرآت مسعودی کا مطلب غالباً جنوبی اوچھ سے ہے کیوں کہ دونوں میں یہ بڑا ہے اور یہیں سے اجودھن کو یعنی پاک پٹن کو جہاں حضرت فریدالدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے راستہ جاتا ہے۔ یہ اوچھ اب ریاست بھاولپور میں ہے۔ ملتان اور اجودھن کے بعد بقول مرآت مسعودی کے دہلی کا نمبر آتا ہے۔ جب سالار مسعود غازی اجودھن سے دہلی آئے تو یہاں راجہ مہی پال تھا دہلی میں کئی روز تک سخت لڑائی ہوئی۔ مگر اسی زمانہ میں کچھ تازہ دم لوگ غزنیں سے سپہ سالار مسعود غازی کی فوج میں آگئے۔ ان لوگوں میں بختیار، سالار سیف الدین، امیر سید عزالدین، ملک دولت، میاں رجب اور امیر سید نصر اللہ بھی تھے۔ مرآت مسعودی نے ہی بختیار اور سالار سیف الدین کو سالار شاہو کے رشتہ داروں میں سے بتایا ہے۔ اس کتاب کا قول ہے کہ وزیر نے ان لوگوں پر سختی کی اور بلا سلطان محمود کے حکم کے ان کی جائدادیں ضبط کیں اس لئے یہ لوگ ہندستان میں چلے آئے۔ الغرض اس تائید غیبی اور وقت پر کمک پہونچ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ کم وبیش ایک ماہ کا رن پڑا۔ اور فتح بالآخر سپہ سالار موصوف کو نصیب ہوئی اگرچہ بہت سے ساتھی شہید ہوئے جن میں امیر سید عزالدین بھی تھے۔ سپہ سالار موصوف نے امیر بایزید جعفر کو کچھ فوج کے ساتھ یہاں چھوڑا تاکہ وہ ملتان، اوچھ اور دہلی کی نگرانی رکھیں اور خود میرٹھ کو روانہ ہو گئے۔ یہ بیان بھی نہایت دلچسپ ہے اور اس کا جانچنا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلا سوال تو راستہ کا ہے یعنی اجودھن سے دہلی کو راستہ کہاں ہو کر

جاتا تھا جواب ریاست پٹیالہ میں ہے۔ اس مقام کو بعض مسلمان مورخین نے تبر ہندہ بعض نے بھاٹیہ اور کچھ نے بھاٹی لکھا ہے یہ وہی جگہ ہے جس پر محمود غزنوی نے سنہ ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ء میں حملہ کیا اور بقول یمینی لعتبی (ترجمہ انگریزی رینالڈس صفحہ ۳۲۵) کے چوکی قائم کی تاکہ اشاعت اسلام میں ترقی ہو۔

بھاٹیہ کا ذکر راستوں کے سلسلہ میں ابوریحان البیرونی نے بھی کیا ہے۔ بقول طبقات ناصری (انگریزی صفحہ ۴۴۹) کے شہاب الدین غوری بھی ملتان سے دہلی کو اسی راستہ سے آیا۔ بقول ونسنٹ اسمتھ (آکسفورڈ تاریخ ہند) کے دہلی سے ملتان کو بھٹنڈہ ہوکر فوجی سڑک گئی ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی دہلی سے ملتان کو ایک لائن ہوتی ہوئی شاہراہ عام ہے پس جب سلطان محمود نے بھٹنڈہ کو فتح کر لیا اور یہاں کے راجہ بجے رائے کی خودکشی کے بعد محمود کا تسلط ہو گیا تو سپہ سالار مسعود غازی کے لئے یہ راستہ صاف اور کھلا ہوا تھا۔

اب قبل اس کے کہ ہم بھٹنڈہ سے دہلی کا رخ کریں یہاں ایک دلچسپ مقامی روایت کا تذکرہ ضروری ہے انڈین اینٹی کواری (Indian Antiquary) جلد ۸ صفحہ ۲۰۹ پر سر ولیم مونیر نے ریاست الور کے میو قوم کی بابت جس پر حال میں بغاوت کا الزام لگایا گیا ایک مقامی روایت لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں سالار مسعود غازی کا جھنڈا رہتا ہے اور وہ محمد غوری (صحیح محمود غزنوی) کے بھانجے یا بھتیجے تھے ان کا مزار بہرائچ میں ہے انھوں نے یہاں کے ۹۸۹ قلعے فتح کئے اور جو راجپوت ان کے زمانہ میں مسلمان ہوئے وہ میو کہلائے۔ یہ کہ پہلے یہ لوگ سالار موصوف کے جھنڈے کو پوجتے تھے مگر اب مولویوں کے وعظ سے یہ بات کم ہو گئی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ اس مقامی روایت میں اس قدر سچائی ہو کہ بھٹنڈہ سے گذرتے وقت نراین پور، تھانہ غازی سالار پور، وغیرہ کی طرف سپہ سالار موصوف کا دھاوا ہوا ہو اور انھوں نے ان اطراف میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں کافی وقت صرف کر کے کامیابی حاصل کی ہو ان کے اس طریقہ سے بھی معلوم ہوتا ہے

کہ جب ان کو ایک تبلیغ میں کامیابی ہو جاتی تھی تو وہ آگے بڑھ جاتے تھے۔

دہلی کا وجود اور وہاں کا راجہ

اب بڑا دلچسپ تاریخی سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دہلی کا وجود بھی تھا یا نہیں یا محض مرآت مسعودی نے قصہ گھڑ لیا۔ زمانۂ حال کے بعض مورخین نے جن میں ڈاکٹر ناظم صدیقی بھی ہیں خیال ظاہر کیا ہے کہ محمود کے زمانہ میں دہلی کا وجود نہ تھا۔ اور اس جماعت کے مورخین نے تاریخ فرشتہ کی اس روایت کو غلط قرار دیا ہے کہ جب سبکتگین اور محمود سے لڑنے کے لئے پنجاب کے ہندو شاہی راجہ جے پال نے ہندستانی راجاؤں کو بلایا تو ان میں راجہ دہلی کی فوج بھی تھی۔ اگر اس جماعت کے مورخین کا یہ خیال صحیح ہے تو صاف ظاہر ہے کہ محمود کے عین ما بعد اور سپہ سالار مسعود غازی کے زمانہ میں دہلی کا وجود اور مرآت مسعودی کی روایت غلط ٹھیریں گے۔ مگر ہم کو مورخ ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ جنرل کننگ ہم نے آرکیوجیکل سروے ہند کی رپورٹ میں جلد اول کے صفحہ ۱۳۸ پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس میں دکھایا ہے کہ اننگ پال تومر اول عرف بلن دیو نے دہلی کو ۷۳۱ء میں اور بقول دیگر ۷۳۶ء میں یعنی سپہ سالار مسعود غازی سے تین سو سال قبل کئی سال کی ویرانی کے بعد بسایا۔ اگرچہ اس زمانہ میں یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اگر کوئی بڑی جگہ ہوتی تو ابوریحان البیرونی اور اس سے قبل چینی سیاحان فاہیان اور ہوئین سینگ اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ ٹاڈ صاحب بھی راجستھان میں جنرل کننگ ہم کی تائید کرتے ہیں اگرچہ انھوں نے اس کی بناڈالنے کا سال ۷۹۲ء درج کیا ہے۔ مورخ ویدیا، ونسنٹ اسمتھ اور ڈاکٹر ناظم صدیقی کی رائے ہے کہ اننگ پال تومر دوم نے ۱۰۵۱ء یا ۱۰۵۲ء میں دہلی کا قلعہ بنایا جس کا نام لال کوٹ رکھا۔ اگر یہ سنہ صحیح ہے تو یہ زمانہ سپہ سالار موصوف کے بیس برس بعد ہوگا۔ مگر قلعہ کا بنایا جانا اور بستی کا بسایا جانا

مرادف نہیں ہیں - یہ بالکل ممکن ہے کہ آبادی پہلے ہوئی اور قلعہ بعد کو تعمیر ہوا - تومر
قوم کے بانی دہلی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے جیسا کہ پتھر کے اس کتبہ سے ثابت
ہے جو محمد شاہ تغلق کے زمانہ کا یعنی ۱۳۲۸ء کا ہے یہ موضع سرین متصل دہلی سے برآمد
ہوا اور وہ بتاتا ہے کہ ملک ہریانہ میں تومروں نے شہر ڈہلکا (دہلی) کو بسایا - اور
یہ کہ گاوں سراول (موجودہ سرین) اندر پرستھ کے پراتگنہ (حال پرگنہ) میں تھا (اپیی
گرافیا انڈکا جلد اول صفحہ ۹۳) صرف اس قدر سوال ہے کہ اننگ پال اول اس کا بانی
تھا یا اننگ پال دویم جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے - کننگ ہم صاحب نے ابوالفضل، تاریخ
گوالیار مصنفہ کھرگ رائے بزمانہ شاہجہاں اور اُن کتبہ جات کے حوالہ سے جو دہلی
کی قطب صاحب والی لاٹ پر کندہ ہیں دکھایا ہے کہ اننگ پال تومر اول کے زمانہ
میں بسایا گیا - جس کی تخت نشینی ۷۳۶ء میں ہوئی - اور فرشتہ سے بھی یہی معلوم
ہوتا ہے کہ محمود کے زمانہ میں دہلی کا وجود تھا - اور یہی مرآت مسعودی کی روایت ہے
اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے کہ اننگ پال تومر دویم نے دہلی کو بسایا تو کننگ ہم
صاحب کے قول کے مطابق اس سے اول کے ۱۹ تومر راجہ کہاں کے راجہ مانے جائیں
گے - پھر ایک بات اور بھی ہے - فرشتہ، ویدیا ونسنٹ اسمتھ اور دیگر مورخین نے
لکھا ہے کہ غزنوی سلطنت کی کمزوری کے باعث دہلی کے تومروں نے ۱۰۴۳ء
میں حصار (جس میں اب ہانسی شامل ہے) غزنوی تاجدار سے چھین لیا - تاریخ فرشتہ
ذرا اور آگے بڑھتا ہے اور اس کا قول ہے کہ جب ۴۳۵ھ ۱۰۴۳ء میں راجہ دہلی نے دوسرے
راجاؤں کی مدد سے ہانسی اور تھانیسر محمود کے مقرر کئے ہوئے گورنروں سے چھین
لئے تو اس کامیابی سے نڈر ہو کر بعض راجاؤں نے لاہور پر بھی دھاوا بول دیا -
(جلد اول صفحہ ۱۰۸ ترجمہ) اب اگر ۱۰۵۱ء سے قبل دہلی کا وجود نہ تھا تو پھر ۱۰۴۳ء
میں یہ سب واقعات کس طرح سے رونما ہوئے اور دہلی کے تومر راجہ دہلی کے کیا معنی ٹھیرے

یہ بھی لحاظ رہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے حملے کے زمانہ اور ۱۰۴۳ء میں زیادہ فرق نہیں ہے صرف بارہ تیرہ سال کا فرق ہے۔ مورخین کے اس بیان سے کہ ۱۰۴۳ء میں ہندوؤں نے دہلی سے آگے تک کا علاقہ واپس لے لیا، ظاہر ہے کہ دہلی میں سپہ سالار مسعود غازی کے مقرر کئے ہوئے سردار کیسے رہ سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے چلے جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ سب مقامات جہاں پر سپہ سالار موصوف گئے تھے۔ دوبارہ ہندو راجاؤں کے ہاتھ میں آتے گئے۔ کیونکہ سپہ سالار کے پاس اتنی جماعت نہ تھی کہ اپنے بعد وہ کافی فوج ان مقامات پر چھوڑتے اور نہ ملک گیری ان کا مقصد تھا۔

سپہ سالار کے حملہ کے وقت دہلی کا راجہ

اب یہ دلچسپ تاریخی گتھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے حملہ کے وقت دہلی میں کون راجہ تھا۔ مرآت مسعودی کی روایت تو یہ ہے کہ یہاں کا راجہ اس وقت مہی پال تھا اور اس کا بیٹا گوپال تھا مگر اس بیان کی صحت میں شبہ ہے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تومر خاندان میں مہی پال اور گوپال نام کے راجہ تھے مگر ان کے زمانہ اور سنین میں بڑا اختلاف ہے جس کو مرور ایام اور ہندو تاریخ کی کمی نے بہت مشکل کر دیا ہے۔ کننگ ہم صاحب نے اپنی رپورٹ کے جلد اول صفحہ ۱۴۹ پر گوالیار اور کمایوں گڑھوال کی قلمی تاریخوں کا حوالہ دیتے ہوئے مہی پال کو تومر راجگان دہلی میں سے بتایا ہے۔ کمایوں گڈھوال کی تاریخ نے تو اس کا زمانہ سنہ ۹۶۱ء یعنی سپہ سالار مسعود غازی کے حملے سے ستر ہتّر سال قبل کے لگ بھگ بتایا ہے اور گوالیار کی تاریخ نے اس کا زمانہ سنہ ۱۱۰۵ء لکھا ہے۔ بقول کننگ ہم صاحب کے یہی زمانہ ابو الفضل نے اور آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں مرحوم نے ظاہر کیا ہے۔ یہ زمانہ سپہ سالار موصوف کے حملہ کے ستر پچھتر برس بعد ہوتا ہے۔ بہر حال دونوں زمانے مرآت مسعودی کے بتائے ہوئے زمانہ سے ٹکر نہیں کھاتے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ان دونوں قلمی تاریخوں

کے زمانی قیاسی ہیں نہ کہ بالکل صحیح - اور یہی حالت مرآت مسعودی کی ہے - ڈاکٹر فیوہرز نے اپنی کتاب آرکیولوجیکل سروے صوبہ متحدہ جلد دوم صفحہ ۱۰ پر لکھا ہے کہ اندر پرستھ کا راجہ مہی پال تھا اور شہر میرٹھ (یعنی مہی رٹھ) اسی کی یادگار کے طور پر بسایا گیا - یہ سلسلہ کتبہ لکھن پور بدایوں جس کا حوالہ اوپر آیا ہے اپی گریفیا انڈکا جلد اول صفحہ ۶۳ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مہی پال تومر قوم کا راجہ دہلی کا راجہ تھا - یہ تو صحیح ہے مگر بدایوں والے راجہ توراٹھور تھے نہ کہ تومر جیسا کہ خود لکھن پور کے کتبہ سے ثابت ہے اور پھر جو شجرہ ہم نے مستند ذریعہ سے نقل کر کے اوپر دیا ہے اس میں مہی پال نام کوئی نہیں ہے - البتہ بھون پال کا بیٹا گوپال ضرور ہے - یہ دوسری بات ہے کہ کتابت کی غلطی نے بھون پال کو مہی پال بنا دیا ہے مگر یہ خیال غلط ہے اور صحیح یہی ہے کہ ایک راجہ مہی پال ضرور تھا جس نے مہی رٹھ یا میرٹھ بسایا بہر حال ہم مرآت مسعودی کی روایت کو غلط ٹھیرانے کے لئے ان تاریخی واقعات اور دلایل کے بعد تیار نہیں ہیں -

محمود نے دہلی پر حملہ کیوں نہ کیا
سپہ سالار مسعود غازی اس طرف کیسے آسکے

اب ممکن ہے کہ قارئین کرام ہم سے سوال کر بیٹھیں کہ اگر دہلی کو اس قدر اہمیت حاصل تھی تو محمود غزنوی نے اس کو کیوں چھوڑ دیا اور سپہ سالار مسعود غازی کی نگاہ اس پر کیوں پڑی - تاریخ فرشتہ (ترجمہ جلد اول صفحہ ۵۲) کی روایت ہے کہ سنہ ۴۰۲ھ میں تھانیسر کو فتح کرنے کے بعد محمود کا ارادہ دہلی جانے کا ہوا - مگر اس کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ دہلی کو قبضہ میں رکھنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ملتان کو شاہی صوبوں میں داخل نہ کر لیا جائے اور عقب کو اور بازو کو انند پال کے حملوں سے محفوظ نہ کر لیا جائے - یہ صحیح معلوم ہوتا ہے - اگرچہ فرشتہ کا سنہ غلط ہے کیونکہ محمود نے دوسرا حملہ ملتان پر سنہ ۴۰۱ھ / ۱۰۱۰ء میں کیا جیسا کہ ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں - علاوہ اس کے بھٹنڈا اور نراین پور پر محمود غزنوی کے جو حملے ہوئے اور محمود نے جو فوجی چوکیاں

وہاں قائم کیں ان سے بھی یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ انتر وید یعنی گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں آنے کے لئے محمود اپنے عقب اور بازو کو حملوں سے محفوظ کرکے صحیح فوجی اور جنگی ترکیب اختیار کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر ناظم صدیقی نے صفحہ ۱۰۲ پر ظاہر کیا ہے کہ سروسیم ہیگ کا بھی یہی خیال تھا کہ سلطان محمود دہلی کو لینا چاہتا تھا۔ مگر دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے وہ دہلی کی طرف نہ آسکا۔ وقت کی بات ہوتی ہے محمود جیسا باہمت اور بارعب تو یہاں تک نہ پہونچ پایا مگر اس کے سامنے کے طفل مکتب سپہ سالار مسعود غازی جن کے لئے محمودی اقبال اور محمودی رعب اور فتوحات کی وجہ سے راستہ کھلا ہوا تھا، اس سرزمین تک پہونچ گئے۔ یہاں یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ شہر دہلی پر کیا کیا افتادیں پڑیں۔ کیا کیا نیرنگیاں اس نے دیکھیں۔ کبھی بگڑا تو کبھی سنبھلا۔ حتیٰ کہ اب تک یہی سلسلہ جاری ہے۔ بقول شاعر ؂

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور

ایں دلم ہست کزیں گونہ ہزاراں دیدست (جافظ)

میرٹھ اور وہاں کا راجہ

اب میرٹھ کی باری آئی۔ دیکھیں یہاں کیا ہوا۔ مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ دہلی میں چھ سات ماہ کے قیام کے بعد سپہ سالار مسعود غازی نے میرٹھ کا رخ کیا۔ ان کے کارنامے سُن سُن کر یہاں کے راجہ پر دہشت طاری تھی۔ اس لئے ایلچیوں کے ہاتھ تحفے تحائف بھیج کر عرض کیا کہ ملک آپ کا ہے بندہ مطیع اور فرماں بردار ہے۔ نرم زبانی بڑی چیز ہے بقول شاعر ؂

خسروا گر انگبیں مے خواہی از شکر لباں ؛ اول اندر کام شیریں کن زبان خویش را

اس کا یہ اثر ہوا کہ سپہ سالار موصوف نے راجہ کے ساتھ کسی قسم کی مخالفت نہ کی اور قنوج کی راہ لی۔ اس مختصر سے اور سیدھے سادے بیان میں کئی ایک نکتے پوشیدہ ہیں۔ اول تو اس سے ثابت ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی خواہ مخواہ بلا مخالفت کسی کے مقابلہ میں لڑائی نہیں ٹھانتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کو ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔ تیسرے یہ کہ وہ صلح کن

اور آشتی پسند تھے ۔ میرٹھ کے راجہ کے اس رویہ کی وجہ ایک اور بھی ہے ۔ ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب آرکیولوجیکل سروے ہند کی جلد دوم صفحہ ۱۱۱ پر بحوالہ ایلیٹ جلد دوم صفحہ ۲۱۹ کے لکھتے ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں برن کے راجہ ہروت نے میرٹھ فتح کر لیا تھا اور یہاں بڑا مضبوط قلعہ بنایا تھا ۔ یہ ہروت ڈور راجپوت وہی راجہ ہے جس نے برن (بلند شہر) پر حملہ کے وقت محمود غزنوی کی اطاعت کر لی تھی اور معہ دس ہزار ساتھیوں کے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا ۔ (عتبی ، عنصری ، فرشتہ) ایسی حالت میں راجہ کا سپہ سالار موصوف کے ساتھ نرمی سے پیش آنا کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے ۔

میرٹھ میں سپہ سالار مسعود غازی کی یادگار

ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب کے جلد دوم صفحہ ۱۱۲ پر لکھتے ہیں کہ قطب الدین ایبک نے سنہ ۱۱۹۴ء میں میرٹھ میں سپہ سالار مسعود غازی کی یادگار میں ایک مقبرہ بنوایا ۔ اور یہی روایت ڈسٹرکٹ گزیٹیر میرٹھ نے بھی لکھی ہے ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ تواریخ فیروز شاہی ، سفر نامہ ابن بطوطہ اور مرآت مسعودی سے بہت قبل یہاں پر سپہ سالار موصوف کے متعلق مقامی روایت موجود تھی ۔ کیوں کہ قطب الدین ایبک اور سپہ سالار موصوف کے درمیان ڈیڑھ سو سال کا فرق ہے ۔ ہم یہاں ضمناً ایک اور دلچسپ روایت میرٹھ کے سلسلہ میں عرض کریں گے ۔ ڈاکٹر فوہرر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرٹھ کی جامع مسجد کو محمود کے وزیر احمد ابن حسن میمندی نے تیار کرایا تھا سنہ ۴۰۹ھ / ۱۰۱۹ء میں ۔ اگر یہ صحیح ہے تو سپہ سالار کے آنے سے قبل میرٹھ میں مسلمانوں کا وجود ثابت ہے اور ایک وجہ یہ بھی راجہ کے مخالفت نہ کرنے اور سپہ سالار موصوف کے یہاں آنے کی ہو سکتی ہے ۔ میرٹھ کے متعلق مرآت مسعودی کی روایت وجوہ مندرجہ بالا کی بنا پر یقیناً صحیح ہے

میرٹھ سے چل کر مرآت مسعودی نے درمیانی مقامات کو چھوڑ کر قنوج کا ذکر کیا ہے ۔ مگر ہم کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ درمیانی مقامات کا ذکر کرنا ہو گا ۔ مرآت مسعودی میں اُن

کے عدم تذکرہ کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض مرتبہ واقعات کو ایک ماخذ سے اخذ کرنے میں ان میں سے کچھ نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ یا ممکن ہے کہ ملا محمد غزنوی ہی نے ان پر روشنی نہ ڈالی ہو۔ بہر حال میرٹھ سے چل کر قنوج تک راستہ میں بہت سی ایسی جگہیں تھیں جو پرانی اور سپہ سالار مسعود غازی کے نقطۂ خیال سے اہم ہونگی ان کی بابۃ جو قیاسات اور مقامی روایتیں ہیں ان کو ہم ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میرٹھ سے قنوج پہونچنے کے لئے دریائے گنگا عبور کرنا ضروری ہے خواہ وہ درمیانی گھاٹوں میں سے کسی گھاٹ کو عبور کیا جائے۔ اس زمانہ میں ریل اور پل تو تھے نہیں مگر قنوج پہونچنے کے لئے دو راستے تھے یعنی دریائے گنگا کے بائیں کنارے اور داہنے ہاتھ والا۔ ان دونوں میں سیدھا اور مشہور اول الذکر تھا۔ اور مسعود غزنوی کا جنرل احمد نیال تگین بھی بقول بیہقی کے ۱۰۳۳ء میں بنارس اسی بائیں ہاتھ والے راستہ سے گیا۔ سپہ سالار موصوف نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہوگا اگرچہ وہ اپنے سرداروں کے مشن دریا پار دوسری جانب بھی بھیجتے رہے جیسا کہ مقامی روایتوں سے ثابت ہے۔

گڈھ مکتیشر

میرٹھ سے چل کر سپہ سالار مسعود غازی نے گنگا کو گڈھ مکتیشر پر عبور کیا ہوگا جو آج کل بھی ہندوؤں کی تیرتھ کی جگہہ ہے اور جہاں بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔ اس جگہہ دریا پار کر کے ضلع مراد آباد کی موجودہ تحصیل

قصبہ سنبھل

حسن پور اور سنبھل ہوتے ہوئے ضلع بدایوں کے قصبہ جات گنور اور سہسوان سے گذر کر بدایوں آجاتا ہے۔ اس راستہ کے قریب ضلع مراد آباد میں کئی ایک مقامات شالارپور کے نام سے مشہور ہیں اور سنبھل کے قریب نیزے کا میلہ آج تک سپہ سالار مسعود غازی کی یادگار میں ہوتا ہے۔ سنبھل میں جس کا پرانا نام سنبھلشور تھا اور ہمیشہ سے شیوجی کی پوجا کا مرکز رہا ہے غالباً سپہ سالار مسعود غازی کی کوئی روک ٹوک نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس زمانہ میں سنبھل دہلی کے تومروں کا ماتحت تھا اور دہلی میں سپہ سالار

موصوف کو فتح حاصل ہو چکی تھی اور ملحقہ حصہ ملک یعنی میرٹھ اور برن پر محمودی فتوحات کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

قصبہ گنوّر

الغرض اس شاہراہ عام سے گذر کر قصبہ گنوّر پہونچے۔ اس کا پرانا نام بن پوری تھا۔ مگر ایک مسلمان بزرگ کے گنوّر واقع ملک ایران سے آنے اور یہاں رہ پڑنے کی یادگار میں گنوّر کہلایا۔ اس قصبہ میں سالار باری کے نام سے ایک محلہ ہے اور ایک بزرگ تاج الدین ترک کا یہاں مزار ہے۔ جو سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھیوں میں ہی بتائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فوہرر آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا جلد دوم صفحہ ۶ پر لکھتے ہیں کہ سپہ سالار مسعود غازی نے ۴۲۰ھ ۱۰۲۹ء میں

قصبہ ڈبائی - دونڈ گڑھ

بودونڈہ گڑھ موجودہ ڈبائی ضلع بلند شہر کے ڈھاکر راجپوتوں کو وہاں سے نکالا۔ یہ جگہہ قصبہ گنوّر کے محاذ میں دریائے گنگا کے دوسری طرف اور وہاں سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی روایت کا ذکر کتاب مصنفہ مے بل ڈف (مسز ڈبلیو آر ریکم) نے اپنی کتاب کرونولوجی آف انڈیا میں (Chronology of India) صفحہ ۱۱۵ پر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گنوّر کو مستقر بنا کر یا تو سپہ سالار موصوف خود ڈبائی گئے یا اور کوئی تبلیغی مشن وہاں بھیجا۔ گنور سے چل کر شاہراہ عام پر قصبہ سہسوان ضلع بدایوں آتا ہے۔ یہ پرانی جگہہ ہے۔ علاء الدین خلجی کی بنائی ہوئی مسجد یہاں موجود ہے۔ اس راستہ پر ایک موضع سالار نگلہ ہی سہسوان کے قرب میں بھی سپہ سالار موصوف کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب کا مزار بتایا جاتا ہے

اب بدایوں پہونچے جس کا پرانا نام بوڈھا میوتا (Bodha mayuta) تھا لکھن پور کے کتبہ کے مطابق سپہ سالار موصوف کے زمانہ میں ایک راٹھور خاندان کی راجدھانی یہاں تھی۔ اس کتبہ کا مفصل حال ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور اس کی رو سے سپہ سالار موصوف کا بدایوں آنا ثابت کر چکے ہیں۔ اس کے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

بدایوں میں آمد اور راجہ سے جنگ

ہم یہ بھی ظاہر کر چکے ہیں کہ باقیات الصالحات غیر مطبوعہ نے ایک تاریخ محاربات ہند ملّا نور بدخشانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بدایوں میں سپہ سالار مسعود غازی اور راجہ چندر پال سے جھڑپ ہوئی اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ سپہ سالار موصوف نے قلعہ کے باہر قیام کیا اور اپنے استاد امیر ابراہیم کے ہاتھ راجہ کے پاس خط بھیجا۔ راجہ سمجھا کہ سپہ سالار مسعود غازی یہی ہیں اُن کو گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔ اس پر سپہ سالار مسعود غازی اور اُن کے ساتھیوں کو قدرتی طور پر غصہ آیا تو اُنھوں نے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ خفیف سی جنگ ہوئی۔ نتیجہ نہیں معلوم مگر غالباً سپہ سالار موصوف کو یہاں کوئی بڑی فتح نصیب نہیں ہوئی کیونکہ وہ یہاں ٹھیرے نہیں یا راجہ سے مصالحت ہو گئی۔ کتاب محاربات ہند کا اب پتہ نہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس نام کی واقعی کوئی تاریخ ہے یا باقیات الصالحات نے اس کا اقتباس صحیح طور پر دیا ہے مگر یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے لکھن پور کے کتبہ کے سلسلہ میں اوپر دکھایا ہے۔ اس روایت سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ غالباً پہلے راجہ چندر پال سے اور سپہ سالار مسعود غازی سے لڑائی ہوئی نہ کہ چھوٹے راجہ مدن پال سے جیسا کہ ویدیا نے اپنی تاریخ میں خیال ظاہر کیا ہے۔ محاربات ہند اور کتبہ لکھن پور میں پہلے راجہ کا نام ایک ہی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کتبہ لکھن پور باقیات الصالحات کی تصنیف کے ایک عرصہ بعد برآمد ہوا۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس روایت کو باقیات الصالحات نے کتبہ سے لیا بلکہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ باقیات الصالحات ناقابل اعتبار نہیں ہے۔

اگر بدایوں میں سپہ سالار مسعود غازی کو فتح ہوتی تو وہ دہلی کی طرح سے یہاں بھی کسی کو اپنا جانشین چھوڑتے اور کتبہ مذکور کا مصنف کھلم کھلا نہیں تو دبی زبان سے ضرور اس کا اعتراف کرتا۔ بخلاف اس کے اگر کوئی بڑی شکست ہوتی تو سپہ سالار موصوف کا قلع قمع نہیں ہو جاتا اور کتبہ مذکور کا مصنف راجہ چندر پال کی تعریفوں کے پل باندھ دیتا۔

مرآت مسعودی بدایوں کے بارے میں خاموش ہے

اس لئے جیسا کہ ہم نے اوپر خیال ظاہر کیا ہے کوئی نتیجہ خیز جنگ نہیں ہوئی۔ اور ممکن ہے کہ مرآت مسعودی کی خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔ کتبہ کی بابت ہم نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ غالباً گیارھویں صدی عیسوی کے آخر کا یا بارھویں صدی عیسوی کے شروع کا ہے۔ سپہ سالار مسعود غازی کا حملہ بدایوں پر غالباً سنہ ۱۰۳۰ء میں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر فوہرر اور مسٹر ریگیر کی روایتوں سے ثابت ہے۔ اس حساب سے بھی کتبہ کی زمانۂ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈسٹرکٹ گزٹیر بدایوں نے اور مولوی عبدالسلام ایم اے مترجم ریاض السلاطین تاریخ بنگالہ نے اپنے ترجمہ کے صفحہ ۹۴ کے نوٹ میں بدایوں پر سپہ سالار مسعود غازی کے حملہ کا زمانہ سنہ ۱۰۲۸ء قرار دیا ہے مگر ہماری ناچیز رائے میں اس حملہ کو دو تین سال بعد قرار دینا اس وجہ سے زیادہ مناسب ہوگا کہ غزنین سے روانگی کے بعد سے بدایوں تک پہونچنے اور درمیانی مقامات میں قیام کرنے یا لڑنے کا لحاظ کیا جاوے تو سنہ ۱۰۲۸ء صحیح نہیں بیٹھتا۔ اس خیال سے غالباً سنہ ۱۰۳۰ء زیادہ صحیح ہے۔

بدایوں میں آمد کا زمانہ

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ کتبہ لکھن پور کی مراد مسعود غزنوی کے جنرل احمد نیال تگین سے تو نہیں ہے کیونکہ وہ بھی تو بقول بیہقی بنارس تک گنگا کے بائیں کنارے کے راستہ سے گیا۔ ہماری ناچیز رائے میں یہ خیال غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بیہقی ضرور ذکر کرتا۔ پھر کتبہ لکھن پور میں کوئی ایسی عبارت نہیں ہے جس سے قیاس لگایا جائے کہ احمد نیال تگین بدایوں میں ٹھیرا۔ تیسرے جس طریقہ سے جگہ جگہ سپہ سالار مسعود غازی کے بابتہ مقامی روایتیں ہیں۔ احمد نیال تگین کے بابتہ بھی ہونا چاہئے تھیں۔ مگر لوگوں کی زبان پر اس کا نام تک نہیں آتا۔ قطب الدین ایبک شہاب الدین محمد بن سام غوری کے جنرل کے آنے تک اور

کوئی اس طرف آیا نہیں تو بجز سپہ سالار مسعود غازی کے اور کون ہو سکتا تھا۔ بدایوں کی مقامی روایتیں بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی صاحب ان کو افسانہ سمجھ کر نہ مانیں۔ بدایوں کے قریب موضع لکھن پور میں ایک حظیرہ میں کہا جاتا ہے کہ یہاں سپہ سالار مسعود غازی کی انگلی دفن ہے۔ خیر یہ بات تو قابل قیاس نہیں ہے کہ جنگ میں کسی کی انگلی کٹے اور اس کی بابتہ اس قدر کاوش کی جاوے کہ اس کو تلاش کر کے دفن کیا جاوے۔ اسلام کی کمزوری اور شریعت کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے بھی بعض مرتبہ چڑھاوا لینے والے خدام یا ڈفالی بھی اس قسم کا ڈھونگ بنا لیتے ہیں۔ مگر جگہہ کا خیال کرتے ہوئے ممکن ہے کہ اس جگہہ سپہ سالار موصوف کا قیام رہا ہو یا راجہ سے بدایوں کے باہر اس حظیرہ کے قرب و جوار میں جنگ ہوئی ہو۔

بدایوں کی مقامی روایتیں

مقامی روایت کے پرانے ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ اس موضع میں سپہ سالار موصوف کے نام سے تھوڑی سی جائداد بھی وقف ہے جس سے حظیرہ کے خدام فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہاں اسی زمانہ میں سپہ سالار موصوف کی یادگار میں ایک میلہ بھی ہوتا ہے جس زمانہ میں بہرائچ میں ہوتا ہے۔ ایک حظیرہ اسی قسم کا اس راستہ پر جو بدایوں سے قنوج کو جاتا ہے موضع گبجوائی میں ہے اور یہاں بھی میلہ ہوتا ہے۔ اسی فرخ آباد والی سڑک قصبہ اسیت کے قریب تحصیل داتا گنج ضلع بدایوں میں ایک موضع مسعود پور ہے۔ ہم ایک روز اپنی دھن میں وہاں جا پہونچے تو معلوم ہوا کہ پرانی جگہہ ہے اور مسلمان بھی آباد ہیں۔

مسعود پورہ

دو چار معمر لوگوں سے دریافت کیا کہ اس کا نام مسعود پورہ کیوں ہے تو جواب ملا کہ ہمارے بزرگ مسعود بادشاہ کے ساتھ آئے تھے۔ ان کا مزار آگرہ میں ہے سنا ہے کچھ نے کہا کہ ان کا میلہ بہرائچ میں ہوتا ہے۔ فوراً ہمارے دل میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ سپہ سالار مسعود غازی کی یادگار ہے یہ جاہل لوگ ان کو بادشاہ بتاتے ہیں اور ان کا مزار آگرہ میں سمجھتے ہیں۔ ہم نے واپسی پر وہ یادداشت جو حالات وہی

کے نام سے موسوم ہے اور جس کو ۱۲۷۲ف سنہ میں مہتمم بندوبست نے مرتب کیا، محافظ خانہ سے نکال کر دیکھی تو مقامی روایت اس موضع کے بابت یہ ملی کہ تین سو برس ہوئے ایک ہندو راجہ نے اس کو بسایا اور چوں کہ یہاں کنکر کی کان نکلی اس لئے اس کا نام مسعود پورہ رکھا گیا۔ واہ کیا وجہ تسمیہ ہے کسی لالہ صاحب کے زرخیز دماغ کا نتیجہ ہے۔ "ناروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔ کتاب باقیات الصالحات نے ایک دلچسپ نظم سپہ سالار مسعود غازی کے بارے میں لکھی ہے۔ ناظرین کی تفنّن طبع کے لئے ہم درج کرتے ہیں:

زتاریخ پیشانیاں شد پدید — چناں حال مسعود غازی شہید
که از حال حیدر ز نسلِ شریف — فقیه مدینه محمدؐ حنیف
مجاہد جوان فتا شجاع و فتا سخی و فتا — قوی پنجه از نیروے لافتا (مراد از مولا علی)
ستیزش ایاز و تولد تیاب — وفاتش آتابک دگر پیچ و تاب
بشهر رجب ف ۱۹ بست و یک شد ظهور ۴۰۵ھ — چهار و ده آں ۴۲۴ھ گرشت زور غیور ۴۲۴
وطن غزنی و مولد اجمیر بود — ز دفن به بهرائچ عزت فزود
خوشا بخت سالار شاہو پدر — که سالار مسعود باشد پسر
زہے اُمّ ستر معلےؔ کنارہ — درو پرورد علوئی نامدار
زہے خال محمود غزنی نژاد
که رحمت برو باد هر با مداد

یہ عبارت مطلب کے لحاظ سے بالکل مرآت مسعودی کی ہے اس لئے غالباً طبقات الاولیا اور باقیات الصالحات نے اس کو مرآت مسعودی سے لیا ورنہ محاربات ہند کا زمانہ تو مرآت مسعودی کی تصنیف سے بہت پہلے کا بتایا جاتا ہے یعنی علاء الدین عالم شاہ بدایونی کے زمانہ میں۔ قبل بدایوں چھوڑنے کے ہم سپہ سالار مسعود غازی

ف۔ بعض نسخوں میں بجائے شعبان کے رجب ہے۔

کے متعلق ایک مقامی روایت کا ذکر اور کریں گے۔ سہسوان اور گنور کے درمیان گنگا پار کر کے موجودہ ضلع علی گڑھ میں ایک سڑک دادوں ہوتی ہوئی علی گڑھ کو جاتی ہے اس سڑک کے قریب اور موضع بھیکم پور سے متصل ایک مزار سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھیوں میں سے بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ حضرات یہاں آکر شہید ہوئے بدایوں سے آگے چل کر اور گنگا کو پار کر کے موجودہ فرخ آباد کا ضلع شروع ہوتا ہے یہاں سے نکلتے ہی شمالی ہند کی پرانی راجدھانی کمپلہ شہر جو اب اوجڑ ہے اور جہاں درویدی کے قصے مشہور ہیں ملتا ہے۔ وہاں سے موجودہ قایم گنج۔ فرخ آباد ہوتے ہوئے قنوج جا پہونچتے ہیں۔ سپہ سالار مسعود غازی کے زمانہ میں قنوج شمالی ہند کا پایہ تخت تھا اور اگرچہ راجپال کی شکست اور کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے راجہ سر اٹھانے لگے تھے تاہم وہ قنوج کو اپنا سردار اعلیٰ سمجھتے تھے۔

قنوج اور وہاں کا راجہ

مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ جب سپہ سالار موصوف قنوج پہونچے تو راجہ اجے پال (صحیح نام راجپال) نے ان کی آؤ بھگت کی اور اپنے لڑکے کو مع تحائف کے سپہ سالار موصوف کی خدمت میں بھیجا سپہ سالار موصوف نے دریائے گنگ کے کنارے اپنا ڈیرہ جمایا۔ راجہ قنوج خود ان سے ملنے آیا اور کھانے کی دعوت دی۔ سپہ سالار موصوف نے راجہ کی تسلی تشفی کی اور چند روز قیام کر کے آگے بڑھ گئے۔ یہ ایک سیدھا سادہ بیان ہے۔ بظاہر اس میں کوئی بات تنقید طلب نہیں ہے مگر دراصل اس کو جانچنے کی ضرورت ہے کہ کہاں تک صحیح ہے سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے یہاں آنے کے وقت یعنی ۱۳۲۱ھ - ۱۰۳۰ء میں یہاں کا راجہ کون تھا۔ اس بارے میں مرآت مسعودی نے جو نام لکھا ہے یعنی راجپال وہ قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ عتبی، گردیزی، ابن الاثیر اور دیگر مورخین کے مطابق محمود نے ۴۰۹ھ ۱۰۱۸ء میں جب قنوج پر حملہ کیا تو راجہ باری کو بھاگ گیا۔ اور

قنوج فتح ہوگیا۔ مگر محمود کے چلے جانے کے کچھ دن بعد ہندستان کے راجاؤں نے
جن میں کالنجر (بندیل کھنڈ) کا چندیل راجہ گنڈا بہت پیش پیش تھا اتفاق کرکے راجپال
پر اس الزام کی سزا دینے کے لئے حملہ کردیا کہ اس نے بزدلی دکھائی اور محمود کے مقابلہ
سے بھاگ گیا۔ اس حملہ میں راجپال مارا گیا اور اس کا بیٹا ترلوچن پال گدی پر بٹھادیا گیا۔
اپی گریفیا انڈکا جلد ۸ صفحہ ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترلوچن پال کے بعد بشن پال سنہ ۱۰۳۴ء
میں قنوج کے براج کا مالک ہوا۔ اپی گریفیا انڈکا جلد ۵ ضمیمہ صفحہ ۱۰ سے معلوم ہوا کہ اس کتبہ
سے جو جھوسی پلیپٹ کے نام سے مشہور ہے ثابت ہی کہ سمت سنہ ۱۰۸۴ بکرمی مطابق سنہ ۱۰۲۷ء / ۱۰۲۸ء
میں قنوج کا راجہ ترلوچن پال ولد راجپال تھا۔ اس لئے کوئی شک نہیں ہی کہ سپہ سالار
مسعود غازی یہاں اس راجہ کے زمانہ میں آئے نہ کہ راجپال کے زمانہ میں جیسا کہ مرآت
مسعودی نے لکھا ہے۔ البتہ یہ بات کوئی اچنبہ کی نہیں ہے کہ ترلوچن پال سپہ سالار
موصوف کے ساتھ خاطر تواضع سے پیش آیا۔ اگرچہ وہ راجہ گنڈا کے اثر میں تھا جو مسلمانوں
سے جلتا تھا مگر پھر بھی ترلوچن پال کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا حشر تھا! و
خود وہ بھی باری کے حملہ کے وقت بقول گردیزی اور ابن الاثیر کے ایک کثیر جماعت کے
ساتھ محمود کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ چکا تھا! ور قصبہ باری کی تباہی دیکھ چکا تھا۔

ترلوچن پال

مورخ ویدیا جلد سوم کے صفحے ۸۵ پر لکھتے ہیں کہ بالآخر اس ترلوچن پال
نے بھی محمود سے صلح کرلی۔ یہ بات محمود کی طاقت اور اس کا رعب
دیکھتے ہوئے قرین قیاس بھی ہے۔ مرآت مسعودی نے ایک نئی بات اور بھی لکھی ہے کہ
سپہ سالار موصوف کے والد سالار شاہو نے محمود اور راجپال کے درمیان صلح کرادی
تھی۔ ایسی حالت میں کیا تعجب ہے کہ ترلوچن پال نے سالار شاہو کی ان خدمات کو پیش نظر
رکھا ہو۔ بقول ڈسٹرکٹ گزیٹیر فرخ آباد کے قنوج کی مقامی روایتوں میں سے ایک
یہ ہے کہ قنوج کے قریب موضع اسماعیل پور نورالدین میں ایک مزار ہے جو چندن شہید

کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی مرمت بابر بادشاہ نے کرائی اور وہ سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اس مزار کی مرمت کی روایت ڈاکٹر فوہرر نے بھی اپنی کتاب کے جلد دوم کے صفحہ ۷۷ پر لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ خیال پیدا ہو کہ جب مرآت مسعودی نے لکھا کہ قنوج میں سپہ سالار مسعود غازی راجپال کے زمانہ میں آئے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ محمود کے ساتھ آئے ہوں یا محمود کے چلے جانے کے عین مابعد یہ خیال اس وجہ سے غلط ہوگا کہ محمود کے حملہ کے وقت راجہ قنوج سے بھاگ گیا اور عین مابعد وہ باری میں تھا نہ کہ قنوج میں۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں یعنی ۱۰۱۹ سنہ ۱۰۲۰ء میں سن ولادت کے لحاظ سے سپہ سالار موصوف کی عمر پانچ چھ سال کی تھی وہ ایسی حالت میں قنوج کیا آتے۔

قنوج سے مختلف جگہ کو فوجی پارٹیاں بھیجی گئیں

قنوج کو مرکز قرار دے کر سپہ سالار مسعود غازی نے کئی ایک فوجی وفد تبلیغ کی غرض سے ادھر ادھر بھیجے جن کے متعلق مقامی روایتیں ہم کو علاوہ مرآت مسعودی کے دیگر کتب میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ہر منی بختیار کو کانور بھیجا اور وہ وہاں جاکر شہید ہو گئے

گوپامئو۔ کانور۔ مہوبہ

امیر عزالدین لال پیر کو گوپامئو بھیجا۔ ملک فیصل کو بنارس اور اس کے اطراف میں بھیجا۔ امیر حسن کو مہوبہ بھیجا۔ کانور اور مہوبہ کے متعلق ہم کو کوئی مقامی روایت نہیں معلوم ہوئی البتہ ڈاکٹر فوہرر کی کتاب جلد دوم صفحہ ۱۷۲ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مہوبہ ضلع ہمیرپور میں گیارہویں صدی عیسوی سے لیکر بارھویں صدی عیسوی تک کے مسلمانوں کے آثار موجود ہیں۔ ڈاکٹر فوہرر کا خیال ہے کہ ہمیرپور راجہ ہمیر دیو کی یادگار ہے مگر یہ بھی ممکن ہی کہ یہاں ہمرا لوگوں کی یعنی مسلمانوں کی بستی ہو (ہمرا خرابی ہے امیر کی جیسا کہ لکھن پور کے کتبہ سے ظاہر ہے) اسی طرح سے بقول ڈاکٹر فوہرر جلد دوم صفحہ ۱۴۴ کے پھول پور ضلع

میں بھی سپہ سالار مسعود غازی کی فوج کی آمد کی بابت مقامی روایت ہے اور ایسی ہی روایت رنکتہ تحصیل کراولی ضلع آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے، گو یا مئو ضلع ہردوئی اودھ کی بابت روایت میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک سید عزیز الدین لال پیر قنوج سے یہاں آئے اور بعض اقوال کے مطابق ان کو سپہ سالار مسعود غازی نے سترکھ ضلع بارہ بنکی سے بھیجا۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بقول مرآت مسعودی کے ایک ساتھی امیر سیّد عزالدین نامی دہلی میں شہید ہو چکے تھے۔ یہ سید عزیز الدین لال پیر غالباً کوئی دوسرے فوجی افسر تھے۔ ڈاکٹر فوہرر نے اپنی کتاب کے جلد دوم صفحہ ٢٧٩ میں یہی مقامی روایت لکھی ہے کہ لال پیر گو یا مئو میں سترکھ سے آئے۔ ہمارا خیال کہ گو یا مئو بہ نسبت سترکھ کے قنوج سے اور خاص کر اس راستہ سے جو قنوج سے سترکھ کو گیا ہے زیادہ قریب ہے، اس لئے غالباً مرآت مسعودی کی روایت کہ وہ قنوج سے بھیجے گئے زیادہ صحیح ہے۔ ڈسٹرکٹ گزنٹیر اور ڈاکٹر فوہرر نے لکھا ہے کہ جب سنہ ١٢٣٢ء سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں خواجہ تاج الدین حسین یہاں کے گورنر ہو کر آئے تو انھوں نے سید عزیز الدین لال پیر کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ اور بعد کو نواب محمد علی خاں والاجاہ صوبہ دار نے اس کی مرمت کرائی۔

بنارس اور وہاں محمود کے زمانہ میں مسلمانوں کی موجودگی

بنارس کے متعلق مرآت مسعودی کے بیان کی صحت میں لوگوں کو شبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنارس سترکھ سے اس قدر دور تھا۔ درمیان میں رکاوٹیں تھیں۔ ذرائع آمد و رفت و سامان کی قلت تھی۔ مگر ان رضاکاروں کے لئے جو اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے پھرتے ہوں اور دھن کے پکے ہوں یہ رکاوٹیں کیا ہیں۔ غزنین سے لکھا ہیر اور کاہیر سے سترکھ کیسے پہونچ گئے جو بنارس تک نہ پہونچتے اس کے علاوہ آخر اسی زمانہ کے آس پاس احمد نیال تگین بھی تو وہاں پہونچا۔ ڈسٹرکٹ گزنیٹر بنارس

منے لکھا ہے کہ اس شہر کے ایک محلہ میں مسلمان سلطان محمود کے زمانہ سے آباد ہیں بیہقی صفحہ ۴۹۷ پر لکھتا ہے کہ احمد نیال تگین سے قبل بنارس میں مسلمان نہیں آئے۔ احمد نیال تگین کا حملہ ۱۰۳۳ء میں ہوا۔ بخلاف اس کے ابن الاثیر کی تاریخ کامل نے لکھا ہے کہ بنارس میں مسلمان محمود غزنوی کے زمانہ سے موجود تھے (ایلیٹ ڈاوسن جلد دوم) اس لئے یہ مسلمان غالباً انہیں پیشواؤں کی یادگار ہیں جو یا تو سپہ سالار مسعود غازی کے بھیجے ہوئے یہاں آئے اور یا احمد تگین کے ساتھ آئے۔ ایسی حالت میں مرآت مسعودی کی روایت کو یقینی طور پر غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مرآت مسعودی نے اضلاع ہردوئی ولکھنؤ بارہ بنکی کے دیگر مقامات کی بابت ذکر نہیں کیا مگر ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر اور ڈاکٹر فوہرر کی کتاب جلد دوم کے مطابق کئی ایک جگہ اس قسم کی مقامی روایتیں ہیں۔

سانڈی۔ بون بلگرام ملانواں۔ سترکھہ

ان مقاموں میں سانڈی ضلع ہردوئی۔ بون ضلع ہردوئی۔ بلگرام ضلع ہردوئی۔ منڈیاواں۔ اٹھی ضلع لکھنؤ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ملاواں ضلع ہردوئی کی بابت ڈسٹرکٹ گزیٹیر نے لکھا ہے کہ یہ قصبہ ایک عرصہ تک سپہ سالار مسعود غازی کی یادگار میں غازی پور کہلاتا تھا۔ مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ سپہ سالار موصوف قنوج سے سترکھہ گئے۔ سترکھہ قنوج سے سو سوا سو میل ہوگا۔ مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ سترکھہ پہونچنے میں دس روز لگے اس حساب سے دس پندرہ میل یومیہ کا سفر ہوا جس سے مرآت مسعودی کی تائید ہوتی ہی۔ قنوج سے سترکھہ جانے کے لئے سیدھا راستہ بلگرام ملاواں سندیلہ، ملیح آباد ضلع ہردوئی اور بجنور، اٹھی ضلع لکھنؤ ہو کر ہے۔ اس لئے ان مقامی روایتوں کا صحیح ہونا قرین قیاس ہے۔ اس زمانہ میں شمالی ہند کی طرح سے یہاں اسلام اچھی طرح سے نہیں پھیلا تھا۔ کیوں کہ محمود غزنوی قنوج اور باری (غالباً موجودہ باری ضلع سیتاپور) سے آگے نہیں بڑھا۔ اور جنرل احمد نیال تگین دو ایک سال بعد آیا

اس لئے ان مقامات میں تبلیغ کی ضرورت تھی اور اسی لئے جگہہ جگہہ فوجی مشن بھیجے گئے آج کل کے زمانہ سے جب کہ دو ایک پادری، دو ایک مولوی یا دو ایک پنڈت تن تنہا جا کر وعظ اور لکچر دے آتے ہیں حالت جداگانہ تھی اور اسی غرض سے ہر مبلغ کے ساتھ چھوٹا یا بڑا فوجی دستہ جاتا تھا۔ ہم پیشتر بھی ظاہر کر چکے ہیں کہ ایسے موقعوں پر پہلے کیا اب بھی ایک مرکز قائم کر کے آس پاس مشن روانہ کئے جاتے ہیں۔

محمود کے زمانہ میں شمالی ہند میں مسلمانوں کی بستیاں

ویدیا جلد سوم صفحہ ۳۶۹ اور دیگر مورخین سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کے زمانہ سے لے کر سنہ ۱۲۰۰ع تک شمالی ہند میں جگہہ جگہہ مسلمانوں کی بستیاں قائم ہو گئی تھیں۔ یہ بستیاں قائم کرنے والے یا محمود غزنوی یا سپہ سالار مسعود غازی اور احمد نیال تگین کے ساتھیوں میں سے تھے۔ یہ حضرات جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو روانہ ہوتے تھے تو کچھ موزوں لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لئے پچھلے مقام پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ تعنیات کئے ہوئے لوگ کہیں تو دستبرد زمانہ سے ایک عرصہ تک محفوظ رہ کر قائم رہے اور کسی جگہہ اپنے سرداروں کے روانہ ہونے کے کچھ دن بعد ہی تباہ کر ڈالے گئے۔ ہمارے اس خیال کو ان کتبہ جات سے تقویت پہونچتی ہے جو چندر دیو گہڈوال گووند چندر گہڈوال راجگان قنوج اور لکھشما دیو راجہ مالوہ اور گنگ دیو اور کرن دیو راجگان ریاست چھیدی کے بر آمد ہوئے ہیں جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ ان کتبہ جات نے لکھا ہے کہ ان ہندو راجاؤں نے گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں اس حصہ ملک کو جو آج کل صوبہ متحدہ اور پنجاب کے کچھ حصہ پر مشتمل ہے مسلمانوں سے پاک کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسلمان وہی تھے جو محمود غزنوی۔ سپہ سالار مسعود غازی اور احمد نیال تگین کے ساتھ آئے۔ اس لحاظ سے مرآت مسعودی کے بیانات سے اور مقامی روائتیں یقیناً صحیح ہیں۔ یہ دوسری

بات ہے کہ ان میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو گیا ہو۔

بجنور ضلع لکھنؤ امیٹھی، منڈیاواں

قبل اس کے کہ ہم سترکھہ کا حال درج کریں اتنا اور کہیں گے کہ سترکھہ سے بھی جگہ جگہ وفد بھیجے گئے تاکہ مذہب اسلام کی اشاعت کریں۔ ان جگہوں میں ضلع لکھنؤ اور بارہ بنکی کے کئی ایک مقامات ہیں مثلاً قصبہ بجنور ضلع لکھنؤ میں ملک عنبر۔ امیٹھی میں ملک یوسف اور منڈیانواں میں ملک آدم کا شہید ہونا اور مدفون ہونا بتایا جاتا ہے۔

سترکھہ میں سپہ سالار مسعود کی آمد اور قیام

الغرض سترکھہ ضلع بارہ بنکی اس زمانہ میں بڑی جگہ تھی اور ہندوؤں کے تیرتھ کی جگہ۔ بقول ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے سترکھہ کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہاں سورشی لوگوں کے استھان تھے بابا سورشی منی رہتے تھے (دستور کھ)۔ بقول مرآت مسعودی جب سپہ سالار مسعود غازی سترکھہ میں آئے تو ان کی عمر قریب اٹھارہ سال کی تھی یا یوں کہیے کہ سنہ ۴۲۲ھ ۱۰۳۱ء یا سنہ ۴۲۳ھ ۱۰۳۲ء میں وہ یہاں آئے۔ یہاں پر شکار خوب تھا۔ سپہ سالار مسعود غازی کچھ روز تک شکار میں مصروف رہے۔ ایک روز کڑا مانک پور کے راجہ کی طرف سے پیغام آیا کہ یہاں اب تک مسلمانوں نے قدم نہیں رکھا۔ سترکھہ تمھارے رہنے کے قابل نہیں ہے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمارے پاس فوج بہت ہے اور بہرائچ کے اطراف کے راجگان کے پاس بھی بہت ہے ورنہ تم کو دقت پیش آئے گی۔ سپہ سالار مسعود غازی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ خدا جس کو ملک دیتا ہے اس کو ملتا ہے۔ میرا ارادہ یہاں تبلیغ اسلام کرنے کا ہے۔ اگر تمھارا ارادہ لڑنے کا ہو تو دیر نہ کرو۔ دریافت کرنے پر ایلچی سے معلوم ہوا کہ کڑا کے راجہ کا نام دیو نراین اور مانک پور کے راجہ کا نام بھوجپتر ہے۔

راجگان کڑا مانک پور

جب ان دونوں راجگان کا کام دھمکی سے نہ چلا تو انھوں نے یہ چال چلی کہ ایک نائی کو سپہ سالار مسعود غازی کے

پاس بھیجا کہ وہ زہر آلود ناخن تراش سے ناخن کاٹے تاکہ زہر کے اثر سے سپہ سالار مسعود غازی کا خاتمہ ہو جائے۔ سپہ سالار مسعود غازی پر زہر کا اثر ہوا مگر وہ علاج سے اچھے ہو گئے اور یہ ترکیب بھی ناکامیاب رہی۔ سپہ سالار موصوف نے کاہیر میں اپنے والدین کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ جب بی بی ستر معلی نے سنا تو ان کو صدمہ اور پریشانی ہوئی جس کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئیں اور بالآخر وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ بقول مراۃ مسعودی کے سالار شاہو محمود کو اطلاع دینے کے بعد کاہیر سے چل کر ستر کھہ آ گئے۔ بیہقی۔ گردیزی اور دیگر مستند تواریخ کی رو سے سلطان محمود کا انتقال ربیع الثانی ۴۲۱ھ مطابق اپریل ۱۰۳۰ء میں ہوا۔ اس لئے اگر یہ روایت صحیح ہے کہ سالار شاہو نے محمود کو اطلاع دی تو سپہ سالار موصوف کی عمر اس وقت ۱۶ سال کے قریب تھی اگر یہ صحیح ہے کہ اٹھارہ سال کی تھی تو محمود کا انتقال اس سے قبل ہو چکا تھا۔

سالار شاہو کی ستر کھہ میں آنے کی اصلی وجہ

ہماری ناچیز رائے میں کاہیر سے سالار شاہو کے ستر کھہ چلے آنے کی اصلی وجہ یہ ہوئی کہ سالار شاہو محمودی پارٹی کے آدمی تھے۔ محمود کے بعد اور مسعود غزنوی کے تخت نشین ہونے پر جو عزل و نصب ہوا اس کی وجہ سے سالار شاہو کا کاہیر میں رہنا مناسب نہ تھا۔ اُن کے پُرانے مخالف احمد ابن حسن میمندی کی دوبارہ وزارت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ جلد سے جلد غزنیں کے قریب سے دور دراز مقام پر چلے آئیں اور ایسی حالت میں ستر کھہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کے پاس چلا آنا ایک قدرتی فعل تھا مراۃ مسعودی نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ جس زمانہ میں محمود کا انتقال ہوا اس زمانہ میں سالار شاہو کاہیر سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بقول مراۃ مسعودی کے سپہ سالار موصوف نے سالار سیف الدین کو جو ان کے عزیز تھے اور میاں رجب کو تو ال کو بہرائچ کی طرف بھیجا۔ اسی کے بعد ارجگان

کڑا مانکپور نے لڑائی کی تیاریاں کردیں اور ان کا پتہ یوں چلا کہ اُن کے قاصد بہرائچ جاتے ہوئے دریائے سرجو پر راستہ میں پکڑے گئے اور ان کے پاس اس مطلب کے خطوط پکڑے گئے کہ ایک طرف سے راجگان بہرائچ اور دوسری طرف سے راجگان کڑا مانک پور سپہ سالار مسعود غازی پر حملہ کردیں۔

مانک پور پر سالار شاہو کا حملہ اور اس کی وجہ

چنانچہ آپس میں اس مصیبت کو دور کرنے کا مشورہ ہوا اور صلاح قرار پائی کہ سالار شاہو کڑا مانک پر حملہ کریں سالار شاہو کڑا مانک پور کی طرف گئے اور لڑائی میں کامیاب ہوئے۔ ملک عبداللہ راجو کو کڑا میں اور ملک قطب حیدر کو مانک پور میں چھوڑا اور خود ستر کھ کو واپس آئے۔ یہ تو مرآت مسعودی کا قول ہے مگر ان مقامات پر دیگر جگہوں کی طرح سے سپہ سالار مسعود غازی کے بارے میں مقامی روایتیں ہیں جن کا ذکر عبداللہ خاں علوی نے اپنی کتاب تاریخ کڑا مانک پور میں کیا ہے۔ اس کتاب کی رو سے سپہ سالار مسعود غازی کے دو ساتھیوں کے مزارات اب تک قصبہ کڑا میں موجود ہیں جن میں سے ایک بزرگ کا نام حاجی جمال تھا۔

کڑا اور مانک پور میں سپہ سالار کے ساتھیوں کے مزارات

مانک پور میں ایک مقامی روایت یہ ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے انتقال کے بعد یہاں کے راجہ نے جو بھر قوم کا تھا سپہ سالار موصوف کے ساتھی ملک امام الدین کے ساتھ گستاخی کرنا چاہی تو ان کی دعا سے زمین شق ہو گئی اور ملک امام الدین اور اُن کی لڑکی اس کے اندر دفن ہو گئے۔ اور اس وقت سے لوگ اس قبر کو پوجتے ہیں۔ اور تل اور روئی چڑھاتے ہیں۔ کتاب مذکور کے بیان کے مطابق اس مزار کی مرمت کیقباد بادشاہ دہلی نے کرائی۔ مرآت مسعودی میں اس روایت کا ذکر نہیں ہے مبالغہ اور افسانہ کو چھوڑ کر یہ ممکن ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد

ان کے وہ ساتھی جوان اطراف میں تعنیات کئے گئے تھے مار ڈالے گئے ہوں جیسا کہ ہم نے اوپر خیال ظاہر کیا ہے۔

کڑا مانک پور کی مقامی روایتیں

ڈاکٹر فوہرر نے بھی جلد دوم صفحہ ۳۱۷ پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مقامی روایت کے مطابق مانک پور کی لڑائی اس جگہہ پر ہوئی جہاں اب موضع جوکا پار ہے اور جو بیشتر مانک پور میں شامل تھا مانک پور اب ضلع پرتاب گڑھ میں اور کڑا جو دریا کے اس پار ہے ضلع الہ آباد میں شامل ہے۔ ڈاکٹر فوہرر کے بیان کے مطابق ان دونوں مقامات پر پرانے قلعوں اور مندروں کے نشانات موجود ہیں۔

کڑا اور مانک پور کوسمبی (الہ آباد) یا قنوج کے ماتحت تھے

کڑا اور مانک پور کے راجاؤں کے جو نام مرآت مسعودی نے لکھے ہیں وہ غالباً مقامی حاکم تھے کیونکہ ڈاکٹر فوہرر کی تحقیقات کے مطابق یہ راجگان یش پال کے ماتحت تھے اور یش پال کوسمبی کا راجہ تھا جیسا کہ اس کتبہ سے ثابت ہے جو سنہ ۱۰۳۰ء یا سنہ ۱۰۳۵ء کا ہے اور جس کا ذکر ڈاکٹر فوہرر کی کتاب آرکیولوجیکل سروے ہند میں جلد دوم صفحہ ۱۳۸ پر ہے۔ کوسمبی الہ آباد کے ضلع میں ہے۔ یش پال کی بابت بعض مورخین کا خیال ہے کہ راجپال قنوج کا بیٹا تھا اور ترلوچن پال اس کا بیٹا تھا۔ بہرحال اس زمانہ میں کڑا مانک پور الہ آباد کی راجہ کے ماتحت تھا یا قنوج۔ اور اس لحاظ سے دیو نرائن اور بھوج چند مقامی گورنر تھے۔

ڈالمئو (رائے بریلی)

بقول ڈسٹرکٹ گزیٹیر رائے بریلی کے سالار شاہو نے ڈالمئو ضلع رائے بریلی پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے ملک عبداللہ کی ماتحتی میں دیا۔ غالباً کڑا مانک پور سے واپسی پر وہ اس طرف تشریف لائے ہوں گے ستر کھہ سے تبلیغی وفد دیگر مقامات کو بھی بھیجے گئے۔ مثلاً دیوا، اینچو بی ہاصیحہ، ہمنہد ضلع بارہ بنکی

کو جن کی بابت مقامی روایتیں ضلع بارہ بنکی کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر نے درج کی ہیں۔ اس زمانہ میں اس طرف چھوٹے چھوٹے بھر قوم کے راجہ تھے جو قنوج کے ماتحت تھے۔ سپہ سالار موصوف انھیں اطراف میں تھے جب ان کو سلطان محمود غزنوی کے انتقال کی خبر ملی۔ بقول بیہقی غزنیں سے قنوج کا راستہ تین ماہ کا تھا۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ وہ محمود کے انتقال سے کچھ دن تک بے خبر رہے ہوں گے۔ غالبًا محمود کے انتقال نے سپہ سالار موصوف کے پروگرام پر اثر ڈالا اور ان کے والد کی آمد اور والدہ کی وفات نے اس پر مہر لگادی۔ اور اس خاندان نے غزنیں کو واپس نہ جانے کی ٹھان لی۔ جو دستہ فوج کا بہرائچ کو سالار سیف الدین کی سرکردگی میں بھیجا گیا غالبًا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ جنگی مصلحت سے مناسب یہی تھا کہ راجگان بہرائچ کی پیش قدمی سے قبل جس کی ترغیب اُن کو راجگان کڑا اور مانک پور نے دی تھی اور جس کی بابت ان خطوط سے بھید کھلا جو دریائے سرجو پر پکڑے گئے اور غور کیا جاوے گا تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ تو سپہ سالار موصوف کی غرض تھی ہی اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا مگر تبلیغ کے سلسلہ میں تلوار اٹھانے میں اُنھوں نے پیش قدمی نہیں کی بلکہ جب اس تبلیغ کو دھمکی یا لڑائی کے ذریعہ سے روکا گیا تو مدافعانہ طور پر سپہ سالار موصوف نے اور اُن کے ساتھیوں نے بھی حملے کئے۔

سالار سیف الدین نے بہرائچ پہونچ کر سپہ سالار مسعود غازی سے رسد طلب کی

الغرض بقول مرآت مسعودی کے بہرائچ پہونچ کر سالار سیف الدین نے اطلاع دی کہ یہاں جنگل ہی جنگل ہے اور رسد نہیں ملتی۔ کھانے کے لئے غلّہ بھیجئے۔ اس پر سپہ سالار مسعود غازی نے مقامی چودھریوں کو جمع کیا جن میں سدھور ضلع بارہ بنکی اور امیٹھی ضلع لکھنؤ کے چودھری بھی شامل تھے اور اُن سے غلہ طلب کیا۔ ان کی تسلّی تشفی کی اور اول غلّہ کی قیمت ادا کی اور بعد کو اُن سے غلہ لیا، اگرچہ چودھریوں نے اصرار کیا کہ وہ قیمت بعد کو لے لیں گے۔ مرآت مسعودی کے اس

بیان کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سپہ سالار مسعود غازی کا یہ برتاؤ نہ محض
پولیٹیکل دانائی اور دور اندیشی پر مبنی تھا بلکہ اس سے ان کی ایمان داری اور انصاف کا بھی
پتہ چلتا ہے۔ لوٹ مار ان کی غرض ہوتی تو یقیناً بلا قیمت ادا کئے ہوئے بہت سا غلہ
میسر آجاتا۔ الغرض اس کے کچھ دن بعد سالار سیف الدین کا پیام آیا کہ ہم کو یہاں کے ہندوؤں نے
چاروں طرف سے گھیر لیا ہے آپ ہماری مدد کیجئے۔ اب سپہ سالار مسعود غازی کو بجز اس کے
اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود بہرائچ جاویں۔ سالار شاہو سے اجازت چاہی تو انھوں
نے بوجہ پیری اور محبت پدری کے پس وپیش کیا اس پر سپہ سالار موصوف نے وعدہ کیا
کہ وہ چند روز بہرائچ رہ کر اور شکار کھیل کر واپس آجاویں گے۔ یہ کون جانتا تھا کہ وعدہ
پورا نہ ہو سکے گا اور وہ کس خیال میں تھے اور پیر فلک کس خیال میں۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ بہرائچ میں مستقل قیام کا ارادہ نہ تھا الغرض شعبان سنہ ۴۲۳ھ / جولائی سنہ ۱۰۳۲ء میں
جب کہ ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی وہ بہرائچ کو روانہ ہوئے۔

بہرائچ قنوج کے ماتحت تھا وہاں کا مذہب اور حالت

بہرائچ میں اس زمانہ میں جنگل ہی جنگل تھا۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے خود مختار راجہ تھے اگرچہ وہ
برائے نام قنوج کے ماتحت تھے۔ سہٹ مہٹ (Seht Mehut) ضلع
بہرائچ کے قریب سنہ ۱۹۰۷ء میں ایک کتبہ برآمد ہوا جو اب لکھنؤ کے عجائب گھر میں موجود
ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قنوج کے راجہ چندر دیو گہڑوال نے ان اطراف کے
چھ گاؤں برہمنوں کو دئے (ایپی گرافیا انڈکا جلد ۷-۸) اس سے قنوج کی ماتحتی
ثابت ہے مگر یہ ماتحتی ایسی ہی تھی کہ سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھ راجہ قنوج کے
اچھے برتاؤ کے باوجود وہ ان ماتحت راجاؤں کو سپہ سالار موصوف کے ساتھ جنگ کرنے
سے نہ روک سکا یا اس نے روکنا نہ چاہا۔ بہرائچ کی اس وقت یہ حالت تھی کہ وہ ہر قوم

کی جس کے نام پر بہرائچ کا نام ہے بستی تھی - اس قوم کے چند نفوس حاشیہ جنگل پر آج بھی اس ضلع میں اور ملحقہ اضلاع میں موجود ہیں - یہ لوگ ہندستان کے قدیم باشندگان میں سے ہیں جن پر آرین تہذیب اور شائستگی کا کم اثر ہوا اور جو اپنے قدیم مذہب کے دلدادہ تھے جن میں آفتاب کی پرستش بھی شامل تھی - بہرائچ میں سورج کنڈ پر آفتاب کی پرستش کی بہت بڑی جگہہ تھی جہاں سورج گرہن اور چندر گرہن کے روز اور اتوار کو بھی جاتریوں کا بڑا مجمع ہوتا تھا کیوں کہ یہ دن آفتاب سے (رادت وار) منسوب ہے - انھیں بھر لوگوں میں بدھ مت کی اشاعت کے لئے مہاراج گوتم بدھ نے بھی بہت بہت کو اپنی حیات میں مرکز بنایا تھا اور بدھ مذہب کے آثار آج تک وہاں موجود ہیں - مگر جب چوتھی صدی عیسوی میں بدھ دھرم کا تنزل ہوا تو قدیم ویدک دھرم یعنی برہمنوں کے مذہب کا زور ہوا - مگر باوجود اس سنبھالے اور زور کے وہ بھروں کی پرانی عبادتوں کو نہ مٹا سکے - اس لحاظ سے بہرائچ پر سب سے پہلے مسلمانوں ہی کی نگاہ تبلیغ کے لئے نہیں پڑی بلکہ ان سے قبل یہاں بدھوں کے اور برہمنوں کے مچھیٹے بھی رہ چکے تھے -

سالار شاہو کا ستر کھہ میں انتقال

الغرض سپہ سالار موصوف کا یہاں چند ہی روز قیام ہوا تھا کہ ملک فیروز نے ستر کھہ سے خبر بھیجی کہ سالار شاہو کچھ روز بیمار رہ کر انتقال کر گئے - صاف ظاہر ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کو اس ناگہانی موت کا کس قدر صدمہ ہوا ہوگا خاص کر ایسے وقت میں جب کہ اُن کو ہر وقت ایک تجربہ کار فوجی سردار کے مشورہ کی ضرورت تھی - مگر واہ رے ہمت صبر اور استقلال کہ اس میں بال برابر بھی فرق نہ آیا - معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی عدم موجودگی اور دربار غزنیں سے بے تعلقی نے اب ان کو اور بھی آزاد کر دیا اور اس کی پروا نہ رہی کہ بہرائچ میں رہنا خطرناک ہے یا وہاں سے چلا جانا مناسب ہے

بہرائچ کے راجاؤں کا پیام

اسی عرصہ میں بہرائچ کے راجاؤں کا پیام آیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ، یہ مقام تمھارے لایق نہیں ہے۔ سپہ سالار مسعود غازی نے نہایت تدبیر سے کام لے کر جواب دیا کہ میں خود جانتا ہوں کہ یہ جنگل اور خرابہ ہے۔ میں بسنے کے لئے یہاں نہیں آیا۔ تھوڑے دن شکار کھیلنے کے بعد چلا جاؤں گا۔ اس تھوڑے سے زمانہ کے لئے عارضی صلح کے طور پر عہد نامہ مرتب کر لیا جاوے یہ ایک معقول تجویز تھی مگر اس کو ٹھکرا دیا گیا۔

بہرائچ میں کون کون راجہ جمع تھے

ایلچی سے سپہ سالار موصوف نے دریافت کیا کہ یہاں کے راجہ کون کون ہیں تو اس نے جواب دیا کہ یہاں پر راجگان رایت سایت، ارجن بھیکن، گنگ، کلیان، سکر، کرن بیربل، اجے پال، سری پال، ہرپال، نرکو، جودھا رائے اور نرسنگھ جمع ہیں۔ ملک نیکدل سپہ سالار موصوف کی طرف سے قاصد بنا کر بھیجے گئے اور انھوں نے سپہ سالار مسعود غازی کا مندرجہ بالا پیام دیا۔ ہندو سرداروں میں آپس میں صلاح و مشورہ ہوا مگر نتیجہ آج کل کی کانفرنسوں کا یعنی "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مضمون رہا۔ کوئی بات طے نہ ہوئی۔ راجہ کلیان نے صلح اور نرمی کا خیال ظاہر کیا مگر راجہ کرن نے اختلاف کیا اور کہا کہ یہاں کی آب و ہوا سپہ سالار موصوف کا کام تمام کر دے گی۔ بالآخر ملک نیکدل کو جواب دیا گیا کہ بہتر ہے کہ تمھارے سالار اس جگہ کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ورنہ جب تک کہ ایک لڑائی نہ ہوگی معاملہ طے نہ ہوگا۔ ملک نیکدل واپس آئے اور سپہ سالار مسعود غازی سے سب حال کہہ دیا۔ راجاؤں نے دریائے کتھلہ کے کنارے اپنا ڈیرہ جمایا۔ سپہ سالار مسعود غازی نے اپنے سرداران لشکر سے مشورہ کیا تو سب کی رائے قرار پائی کہ جنگی مصلحت یہی ہے کہ یہاں راجگان کا انتظار کرنے کے بجائے خود ان پر پہلے سے حملہ کر دیا جائے چنانچہ سپہ سالار مسعود غازی نماز مغرب کے بعد روانہ ہو گئے اور سالار سیف الدین کو آگے آگے بطور ہراول کے روانہ کیا۔

سپہ سالار مسعود غازی کا راجگان پر حملہ اور پہلی جنگ سپہ سالار مسعود غازی کی فتح

راتوں رات سفر کر کے علی الصباح ہندؤں کے لشکر کے قریب پہونچ گئے اور مسلمانوں کی جنگی ترکیب کے مطابق لشکر کو ترتیب دے کر حملہ کیا۔ گھمسان رن پڑا۔ دونوں طرف کے بہت سے لوگ مارے گئے اور زخمی ہوئے مگر جیت سپہ سالار مسعود غازی کے ہاتھ رہی اور کچھ راجہ قید ہوئے۔ سات روز میدان جنگ میں قیام کر کے اور شہدا کو دفن کیا۔ آٹھویں روز بہرائچ کو واپس آئے اب قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں ان بیانات کو تاریخی کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت ہے تا کہ کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے اور آئندہ کے واقعات آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

پہلی جنگ کی وجہ

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہاں فارسی کی یہ مثل صادق آئی کہ "تنگ آمد بجنگ آمد"۔ سپہ سالار مسعود غازی کے مشن، عزت اور ہمت نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ راجاؤں کے پیام سے مرعوب ہو کر یہاں سے چلے جاتے۔ بلکہ اپنی طرف سے عہد نامہ کی تجویز پیش کی جس میں جانبین کے لئے بھلائی اور لڑائی سے بچنے کا ذریعہ موجود تھا۔ مگر جب ان کی یہ بات نہ مانی گئی تو چلے جانے پر لڑائی کو اور بزدلی پر موت کو ترجیح دی۔ اگر ہندو خود دار سورما اس حالت میں ہوتے تو غالباً وہ بھی یہی کرتے۔ تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اعتراض ہوگا کہ سپہ سالار مسعود غازی نے پہلے حملہ کر کے جارحانہ کارروائی کی نہ کہ مدافعانہ۔ مگر یہ خیال غلط ہوگا کیونکہ جنگ میں اکثر مرتبہ بجائے غنیم کے حملہ کا انتظار کرنے کے اس کی حالت اور موقعہ کا لحاظ کر کے اس کے حملہ کو روکنے کی غرض سے پہلے چڑھائی کر دی جاتی ہے چنانچہ پہلی لڑائی کا نتیجہ بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کی یہ کارروائی راست آئی۔ اس موقع پر ہندوؤں کو اپنی جماعت کو پورے طور پر جمع کرنے اور منظم کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ ایک انیس سالہ

نوجوان اس قدر ہٹ، ہمت اور استقلال سے کام لے گا۔ ورنہ مسلمانوں کی تھوڑی سی جمعیت کی ہستی ہی کیا تھی۔ پہلی لڑائی کا یہ نتیجہ نہ ہوتا جو ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوؤں نے اپنی زیادہ فوج ریزرو ہی رکھی ہو۔

پہلی جنگ کہاں ہوئی

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ جغرافیہ اور نقشے کے لحاظ سے لڑائی کس جگہہ ہوئی۔ دریائے کٹھلہ بھکلہ کی خرابی ہے جو آج کل تحصیل نان پارہ ضلع بہرائچ کے شمال مغربی گوشہ میں جنگل میں چودہ پندرہ میل بہہ کر دریائے راوتی میں مل جاتا ہے۔ مرآت مسعودی کے ہاٹلیے والے نسخے میں ہم کو اس جنگل کا نام تارامئی ملا مگر اور نسخوں میں یہ نام نہیں پایا۔ موجودہ زمانہ میں اس نام کا کوئی جنگل بہرائچ کے جنگلوں میں سے نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ سرحد بہرائچ اور نیپال پر بہرائچ سے شمال و مغرب میں پچیس تیس میل کے فاصلہ پر جنگل میں ایک جگہہ تاراماں مشہور ہے۔ کیا تعجب ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ہندو بزرگ فقیر تارامئی ہوں جو یہاں اپنا استھان جمائے ہوئے ہوں یا جنگل کا نام تاراین ہو اور کتابت کی غلطی سے تارامئی ہو گیا ہو۔ دریائے بھکلہ موجودہ پرگنہ چروہا تحصیل نان پارہ میں ایک تالاب سے نکلتا ہے جس کو بج بجا کہتے ہیں۔ قدیم گاؤں چروہا بہرائچ ۲۶ میل پر ہے۔ بقول ڈاکٹر فوہرر جلد دوئم صفحہ ۲۹۳ کے چروہا میں راجہ سہر دیو یا سہل دیو نے ایک قلعہ بنایا تھا اور یہ وہی راجہ ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور جو بعد کی لڑائیوں میں سپہ سالار مسعود غازی سے لڑا۔ فاصلہ کے لحاظ سے، رات بھر سفر کے لحاظ سے، دریائے بھکلہ کے لحاظ سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی جنگ پرگنہ چروہا میں دریائے کٹھلہ سے جنوب میں ہوئی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت کھلی جگہہ جو لڑائی کے لئے موزوں تھی کہاں کہاں تھی اور جنگل کس کس جگہہ تھا۔ اس قدر تفصیلات کا ہی نو سو برس کے بعد معلوم ہو جانا کیا کم غنیمت ہے۔

گونڈا کا راجہ سہل دیو سہر دیو یا سہر دھواج

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کا قیام بہرائچ خاص میں ہوگا اور یہاں کا مقامی راجہ یا تو بہرائچ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا اور یا یہ جگہ اُس کی راجدھانی نہ تھی۔ بلکہ خیال اغلب یہ ہے کہ بہرائچ راجہ سہر دیو کی حکومت میں شامل تھا جس کا پایہ تخت ضلع گونڈا میں تھا اور یہی روایت ڈسٹرکٹ گزنیٹر گونڈا کی ہے۔

سورج کنڈ پر سپہ سالار مسعود غازی نے باغ لگایا

بقول مرآت مسعودی کے پہلی جنگ سے واپسی کے بعد سپہ سالار مسعود غازی نے سورج کنڈ کے کنارے ایک مہوئے کے درخت کے نیچے آرام کیا کیوں کہ یہ جگہ اُن کو پسند تھی۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ جب موت کے بعد حیات ابدی ان کو ملے گی تو وہ تا قیام قیامت اسی جگہ آرام کریں گے۔ یہ جگہ سپہ سالار موصوف کو یہاں تک پسند آئی کہ یہاں اُنھوں نے اپنے ملک کے طرز پر ایک باغ لگانا شروع کیا۔ اور اپنا وقت دل بہلانے کے لیئے زیادہ تر یہاں صرف کرتے تھے۔ اور اس کی درستی میں لگے رہتے تھے۔ اکثر اوقات نماز بھی اسی جگہ ادا ہوتی تھی۔

سورج کنڈ کا بُت بالارکھ توڑنے سے سپہ سالار مسعود غازی کی ممانعت

میاں رجب کوتوال نے یہ رنگ دیکھ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو سورج کے بُت بالارکھ کو توڑ دیا جائے۔ اس پر سپہ سالار موصوف نے ان کو منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے اگر مذہب اسلام کی ترویج ہو گئی تو بت پرستی خود بخود دور ہو جائے گی یہ ایک اہم واقعہ ہے جس کے اسباب اور نتائج ہم آگے چل کر دکھائیں گے۔ الغرض پہلی جنگ کے بعد کو جملہ کے راجگان جوگی درس اور گوبند درس نے ایک ایلچی کے ذریعہ سے سپہ سالار مسعود غازی کی خدمت میں کچھ تحفے تحائف بھیجے۔ اور کہلا بھیجا کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ سپہ سالار مسعود غازی نے جواب دیا

کہ آپ کا جی چاہے تو ضرور آئیے مگر تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں آپ اطمینان سے اپنے ملک پر قابض رہیں۔ کتاب ایشیاٹک ریسرچیز جلد ۱۷ مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۳۲ء صفحات ۲-۶-۲۰-۲۵-۳۰ سے معلوم ہوا کہ حُمبلہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست کوہ کمایوں کے موجودہ علاقہ سے ملی ہوئی ہمالیہ کے سلسلہ میں ہے جہاں بھوئی نسل کے لوگ آباد ہیں اور جن میں بھوئی جاٹ بھی شامل ہیں یہ ریاست دریائے گھاگرہ یا سار وہ کی شاخ کالی کے پورب جانب ہے۔ یہ حصہ کوہ غالباً اب ریاست نیپال کے اس حصہ میں شامل ہے جو اضلاع بہرائچ اور کھیری کے محاذ میں پہاڑ میں واقع ہے کوہ حمبلہ کے راجہ کے ایلچی آنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ کے بھوئی نسل کے لوگ اپنے مذہب میں اتنے پکے ہندو نہ تھے جیسے کہ دامن کوہ کے اور میدان کے۔ کوہ حمبلہ ایک زمانہ میں ملک تبت کا جزو تھا۔ اور یہاں کے بھوئی تبت کے بدھ مذہب اور ہندستان کے ہندو دھرم کے مجموعہ کے زیر اثر تھے وہ گورکھوں کی فتح سے محفوظ رہے اور اسی وجہ سے کمایوں گڈھوال کی طرح یہاں پر ہندو دھرم پوری طرح سے رائج نہ ہو سکا۔" مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ سہر دیو راجہ گونڈہ اور ان راجگان کا خاندان ایک تھا مگر اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ پہلی جنگ میں ہندو یا نسہ پلٹ جانے نے یہ اثر ضرور دکھایا کہ سپہ سالار موصوف کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھنے لگا ورنہ اس خوشامد کی کیا ضرورت تھی۔ مرآت مسعودی نے ان راجگان کے نام درج کئے ہیں جو پہلی جنگ میں شریک تھے۔

بہرائچ میں باہر کے راجگان کے جمع ہونے کی وجہ

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تاریخ نے اپنے آپ کو دھرایا اور سبکتگین اور محمود کے قصے یاد کر کے ہندو سرداروں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ چھوٹی باتوں کے بعض دفعہ بڑے نتائج ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دُھن کا پکا اور بہادر

نوجوان آہستہ آہستہ پورے ملک کو دبالے۔ ہندو دھرم ملیامیٹ ہو جائے اور شروع میں پوری کوشش نہ کرنے کے باعث آخر میں ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ اسی خیال سے ان ہندو راجاؤں کو جمع کیا گیا۔

گنگ دیو۔ کرن دیو۔ ارجن

ان ناموں میں تین نام ہم کو ایسے ملتے ہیں جو زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ ہند میں مشہور تھے۔ یعنی گنگ کرن اور ارجن۔ پہلا راجہ تو وہی گنگ دیو ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس کا ذکر بیہقی (صفحہ ۴۹۷) نے بنارس پر احمد نیال تگین کے حملہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ دوسرا یعنی کرن دیو اس کا بیٹا تھا جو ۱۰۴۲ء یا ۱۰۴۱ء میں گدی پر بیٹھا جیسا کہ ہم نے اوپر دکھایا ہے۔ ارجن راجہ بقول پروفیسر کیل ہارن (انڈین ایپی گریفیا جلد ۸ صفحہ ۲۴۲) کے محمود غزنوی کے زمانہ میں کچھواہا راجپوت گوالیار کا راجہ تھا اور جس نے بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی کے محمود کی اطاعت کرلی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ان زبردست راجاؤں کی فوج کے مقابلہ میں سپہ سالار مسعود غازی کی مٹھی بھر آدمی لڑ کر کیا کامیاب ہوتے مگر بعض مرتبہ باوجود کثیر فوج کی موجودگی کے ذراسی غفلت یا چھوٹے سے سبب سے لڑائی کا پانسہ پلٹ جاتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے رات میں سفر کرنے سے یہی مطلب ہو کہ ان راجاؤں کو جنگی تیاری کا موقعہ نہ دے کر انھوں نے شبخون مارا ہو۔ ان تین بڑے راجاؤں کی شرکت کی بابت ہمارے خیال کو مرآت مسعودی کے اس بیان سے بھی تقویت پہونچتی ہے کہ پہلی شکست کے بعد مقامی راجاؤں نے ہندستان کے راجاؤں سے امداد طلب کی اور اُن میں رائے سہر دیو سجولی سے اور رائے ہر دیو سنبھلونہ سے آکر شریک ہو گئے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بڑے بڑے راجگان بذات خود نہ آئے ہوں بلکہ امداد کے طور پر اپنی فوجیں بھیجدی ہوں مگر نام ان کا ہوا۔

سنبھلونہ سہلوا

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں۔ سہردیو۔ ہردیو۔ سجولی اور سنبھلونہ کی تشریح لازمی ہے۔ یہاں پر مرآت مسعودی نے ناموں کی الٹ پھیر کردی ہے۔ سہردیو وہی راجہ گونڈا تھا جس کا اصلی نام سہر دھوراج تھا اور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے جس نے چروہا میں قلعہ بنایا اور جس کے نام کی یاد اب تک بہرائچ کے ضلع کے موضع سہلوا میں ہے جو جنگل میں دریائے بھکلہ سے شمال میں واقع ہے۔ سنبھلونہ کتابت کی غلطی کی وجہ سے سہلوا کی خرابی معلوم ہوتی ہے۔ ہردیو کوئی مقامی زمیندار بہر قوم سے تھا۔ سجولی اب بھی ضلع بہرائچ کے مغربی حصہ میں تحصیل نان پارہ میں اور جنگل میں موجود ہے۔ الغرض پہلی شکست کے بعد ہندو سرداروں نے نہ محض ہندستان کے دیگر راجاؤں سے مدد طلب کی بلکہ اندر ہی اندر دوسری جنگ کی تیاری شروع کردی۔

راجہ سہردیو کا مشورہ

جب سب جمع ہوگئے تو سہردیو نے یہ مشورہ دیا کہ محض بہادری اور بڑی فوج سے کام نہ چلے گا۔ بلکہ ترکیب سے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان سوار اپنے گھوڑوں کو جھمگٹ کے ساتھ بے تحاشا دوڑاتے ہیں اس لئے کئی ہزار لوہے کی کیلیں زہر آلود بنوائی جاویں اور ان کو میدان جنگ میں پیشتر سے گاڑ دیا جائے تاکہ گھوڑے زخمی ہوکر گریں اور مسلمان سوار بھی گر کر زخمی ہوں اور پکڑے اور مارے جاسکیں۔ اس کے علاوہ آتش بازی سے کام لیا جائے۔ الغرض چند ماہ کی تیاری کے بعد کچھ راجہ دریائے بھکلہ پر دوبارہ جمع ہوئے اور سپہ سالار مسعود غازی کو پیام دیا کہ اگر وہ اپنی خیریت چاہتے ہیں تو سرجو پار چلے جاویں۔ سپہ سالار مسعود غازی نے وہی پہلا جواب دیا اور کہلا بھیجا کہ ملک خدا کا ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے تم بھی تو آخر ہمیشہ سے یہاں نہ تھے۔ اب بجز لڑائی کے کوئی دوسرا چارہ نہ رہا۔

دوسری جنگ اور سپہ سالار غازی کی فتح

سپہ سالار مسعود غازی نے اپنے ساتھیوں سے

مشورہ کرکے یہی رائے قائم کی کہ مخالفین کا بہرائچ آنا ٹھیک نہیں ہے خود چل کر ان پر حملہ کیا جاوے چنانچہ فوج آگے بڑھی تو اس پر آتش بازی پھینکی گئی اور بہت سے سواروں کے گھوڑے لوہے کی کیلوں کی وجہ سے گرے اور سواروں کو گرایا۔ مگر باوجود بڑے نقصان کے کامیابی کا سہرا پھر بھی سپہ سالار مسعود غازی کے سر رہا۔ جب وہ اپنے کیمپ میں واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ایک تہائی ساتھی کام آ گئے۔ مگر فتحیابی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شہدا کو دفن کرنے کا موقع مل گیا اور تین روز تک دریائے بھکلہ پر قیام رہا۔ بہرائچ پھر واپس آئے مگر چوں کہ بہت سے جان نثار۔ دوست احباب وغم گسار شہید ہوگئے تھے اس لئے قدرتاً غمگین رہنے لگے یا تو عبادت الٰہی میں وقت گذرتا تھا اور یا اس باغ سے دل بہلانے میں جو سورج کنڈ پر لگایا گیا تھا۔ یہ لڑائی بھی قریب قریب اسی جگہہ ہوئی جہاں پہلی لڑائی ہوئی تھی اور اگر آتش بازی اور لوہے کی کیلوں سے کام نہ لیا جاتا تو سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھیوں کا اس قدر نقصان جان نہ ہوتا۔ مگر اس کی شکایت کا کسی کو حق نہیں ہے عشق اور جنگ میں سب ترکیبیں جائز سمجھ کر برتی جاتی ہیں آج کل ہوائی جہازوں سے بمب بازی کرنا زہریلی گیس کا پھیلایا جانا اور پانی اور کھانے کی چیزوں کو زہر آلود اشیاء سے متاثر کرنا یورپ جیسے متمدن ملک میں ہوتا ہے تو آتش بازی اور زہر آلود لوہے کی کیلوں کا کیا کہنا راجاؤں کے اس پیام سے کہ سپہ سالار مسعود غازی سرجو پار چلے جائیں مطلب علاقہ بہرائچ کے خالی کر دینے سے ہے اس ضلع کی موجودہ جنوبی حد گھاگرہ ہے مگر چوں کہ دریائے سرجو گھاگرہ کی شاخ ہے اس لئے بعض جگہہ اب بھی گھاگرہ کو دریائے سرجو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ راجاؤں کا یہی مطلب تھا کہ گھاگرہ پار چلے جائیں ورنہ سرجو تو ایک بہت چھوٹا سا دریا ہے اور بہرائچ کی آبادی کے نیچے بہتا ہے۔ اس سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے بہرائچ خاص میں ڈیرے ڈنڈے جما رکھے تھے اور راجاؤں نے اپنا صدر مقام اس سے شمال میں قرار دے رکھا تھا۔

تیسری اور آخری جنگ

الغرض اب تیسری اور آخری جنگ کی تیاری ہونے لگی جو فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔ گزشتہ دو لڑائیوں کے نتیجے دیکھ کر ہندو سرداروں نے اپنی جنگی ترکیب بدل دی اس کے علاوہ انھوں نے دیکھا کہ سپہ سالار مسعود غازی کی جمعیت تھوڑی رہ گئی ہے اب اس کو سنبھلنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔ چنانچہ سہر دیو کی سرکردگی میں ہندو فوج بہرائچ پر بڑھی۔

سپہ سالار مسعود غازی کا خطبہ

جب سپہ سالار مسعود غازی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی باقی ماندہ فوج کو جمع کر کے ایک دل ہلا دینے والا پُرجوش خطبہ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس مرتبہ ہندستان بھر سے فوج جمع ہے۔ چند سال سے میرا اور تمھارا ساتھ ہے تم نے حق رفاقت خوب نباہا تم میں سے کسی کو میری وجہ سے تکلیف پہونچی ہو تو اس کو معاف کیا جائے۔ ہمارے آبا واجداد کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ میدان جنگ سے مُنہ نہیں موڑتے اس لئے ہمارے لئے یہاں قائم رہنا ضروری ہے مگر میں نہایت خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ جس کا جی چاہے یہاں سے چلا جائے بقول مرآت مسعودی کے بھلا کون پتھر کا دل رکھنے والا تھا جو اس خطبہ سے متاثر نہ ہوتا۔ اور کون روباہ صفت تھا جو میدان جنگ سے مُنہ موڑ کر بھاگ جاتا۔ چنانچہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آپ کے پسینہ پر ہم خون بہائیں گے اور مُنہ موڑ کر نہ جائیں گے۔ سپہ سالار غازی کے پاس جو کچھ تھا وہ سب فوج کو بخش دیا۔ اور ایک دستہ کو بطور ہراول کے مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ بہرائچ سے دو کوس چل کر فوجی چوکی قایم کرے اور خود عبادت میں مشغول ہوئے۔

سپہ سالار مسعود غازی کے رفقا کی شہادت

تیرھویں رجب ۴۲۴ھ کو صبح کے وقت مخالفین کا لشکر اس فوجی دستہ کے سر پر آ پہونچا جو آگے بھیجا گیا تھا۔ اس دستہ نے لڑائی شروع کی اور سپہ سالار موصوف کے پاس خبر بھیجی تو وہ

خود بھی اپنی ہمراہی فوج لے کر چلے اور سورنج کنڈ پر ٹھہرے - اس کے بعد پوری فوجوں میں لڑائی شروع ہوئی - کشتوں کے پشتے لگ گئے - جانبین نے داد بہادری دی رات سر پر آگئی مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا - اگرچہ سپہ سالار مسعود غازی کی فوج بہت تھوڑی رہ گئی - دوسرے دن صبح پھر لڑائی شروع ہوئی - ہندو فوج کی تعداد اس مرتبہ بہت زیادہ تھی - دوپہر تک دو تہائی مسلمان شہید ہو گئے جن میں سالار سیف الدین بھی تھے یہ سپہ سالار مسعود غازی کے دست راست تھے ہر مشورہ میں شریک رہتے تھے صاف ظاہر ہے کہ قدرتی طور پر ان کی شہادت کا اثر سپہ سالار مسعود غازی پر کیا ہوا ہوگا مگر بظاہر ان کے حوصلہ میں ذرا سی بھی لغزش نہ ہوئی - سپہ سالار مسعود غازی کے حکم سے جملہ شہدا کو سورج کنڈ میں بطور دفن کے ڈال دیا گیا - کیوں کہ چاروں طرف سے ہندو فوج ان کو گھیرے ہوئے تھی اور اتنا موقع اور وقت نہ تھا کہ قبریں کھودی جاویں بقول مرآت مسعودی کے جب سورنج کنڈ میں بھی جگہ نہ رہی تو اس خیال سے کہ لاشیں مخالفین کے ہاتھوں میں نہ جائیں ان کو غاروں اور کنووں میں دفن کیا گیا اور خود سپہ سالار مسعود غازی نے سب کے جنازوں کی نماز پڑھائی -

سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت

جب سہر دیو نے دیکھا کہ میدان جیت لیا ہے تھوڑے سے مسلمان باقی رہ گئے ہیں آؤ ان کا بھی کام تمام کریں تو چاروں طرف سے نرغہ کر کے تیر برسانے شروع کیے عصر کا وقت ہو گیا تھا لڑائی جاری تھی ایک تیر ۱۴ رجب سنہ ۴۲۴ھ (۱۰ جولائی سنہ ۱۰۳۳ء) کو سپہ سالار مسعود غازی کے گلے میں لگا جس سے وہ کلمہ پڑھتے ہوئے شہید ہو گئے سکندر دیوانہ جو ہر وقت سپہ سالار کے ساتھ رہتے تھے اور چند لوگ جو باقی تھے انھوں نے مہوئے کے درخت کے نیچے قبلہ رخ کر کے لٹا دیا جو چند رفقا باقی تھے وہ شام تک لڑتے رہے یہاں تک کہ ایک ایک کر کے شہید ہو گئے - اتنے میں رات ہو گئی

اور لڑائی تھم گئی۔ رات کے اندھیرے میں باوجود تلاش کے مخالفین کو سپہ سالار مسعود غازی کی لاش نہ ملی رات بھر سپہ سالار مسعود غازی کا وفادار کتا بھی لاش کے پاس رہا اور حفاظت کرتا رہا۔ ہندو فوج چھوت چھات کے خیال سے میدان جنگ سے چلی گئی۔ جو چند نفوس زخمی ہو کر بچ رہے تھے وہ افتاں وخیزاں بہرائچ پہونچے امیر سید ابراہیم کو جن کو سپہ سالار مسعود غازی کیمپ میں چھوڑ گئے تھے اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔

امیر سید ابراہیم نے سپہ سالار غازی کو دفن کیا

دوسرے دن صبح امیر سید ابراہیم میدان جنگ میں گئے۔ انھوں نے سب سے اول سپہ سالار مسعود غازی کو دفن کیا اور پھر دیگر شہدا کو۔

سید ابراہیم کی شہادت۔ راجہ سہر دیو بھی لڑائی میں مارا گیا

رائے سہر دیو کو خبر ہوئی کہ ابھی تو کچھ مسلمان باقی رہ گئے ہیں تو اس نے پھر دھاوا کیا۔ لڑتے لڑتے ادھر رائے سہر دیو مارا گیا اور ادھر میر سید ابراہیم شہید ہوئے اور اس تبلیغی کوشش نے ثابت کر دیا کہ ؎

یک ساعت یک لحظہ یک دم
دگرگوں مے شود احوالِ عالم

کہا جائے گا کہ جب ہندوؤں کی اس قدر فوج تھی تو مراۃ مسعودی کا یہ قصہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پہلی دو لڑائیوں میں سپہ سالار کو فتح ہوئی۔ ہماری ناچیز رائے میں ہندو فوج نے یہ ترکیب چلی کہ بڑا حصہ آخری جنگ کے لئے محفوظ رکھا اور شروع میں کچھ تھوڑی سی فوج بھیجی وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے پاس رزرو کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لئے آخر کے لئے تازہ دم فوج رکھنا چاہئے اور مسلمان جن کی تعداد محدود تھی یہ کر نہیں سکتے تھے کہ وہ بھی آخر تک تازہ دم فوج رکھتے۔ فن جنگ کے لحاظ سے ہندو سرداروں کی یہ ترکیب

نہایت مناسب اور قدرتی بھی - اگر مسلمانوں کے ملک میں ہندو اس طریقہ سے جاتے تو مسلمان بھی یہی کرتے جو ہندوؤں نے کیا بقول مرآت مسعودی کے شہادت کے وقت سپہ سالار مسعود غازی کی عمر ۱۹ سال کی تھی - پیدائش اور شہادت کی جو تاریخیں قمری ماہ کی مرآت مسعودی نے دی ہیں ان کے حساب سے ۱۸ سال دس ماہ ۲۵ یوم کی عمر ہوتی ہے اور انگریزی حساب سے ۱۸ سال ۴ ماہ ۲۴ یوم کی یا یوں کہئے کہ قریب انیس سال کے ذیل کی رباعی سے سن ولادت اور سن شہادت معلوم ہوتا ہے :

محبوبِ خدا بود امیرِ مسعود — در چار صد و پنج در آمد بہ وجود
تا مدت بست در جہاد افزود — در چار صد بست و چار رحلت فرمود

اس رباعی میں "تا مدت بست" غلط ہے یعنی ۲۰ سال کی مدت تک - عمر انیس سال کے قریب ہی تو ہوئی - مصنفہ مے بل آف مسٹر ڈبلیو آر ایلیمر کے حساب سے ۱۲ رجب سنہ ۴۲۴ھ مطابق ۱۵ جون سنہ ۱۰۳۳ء کے تھی - انھوں نے راجہ گوندا کا نام جس سے سپہ سالار مسعود غازی سے لڑائی ہوئی - سوہر دھور اج لکھا ہے (گرانولوجی آف انڈیا صفحہ ۱۱۸)

سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت سلطان محمود کے انتقال سے کتنے دن بعد ہوئی

یہ شہادت سلطان محمود کے انتقال سے دو سال بعد ہوئی مرآت مسعودی کا قول ہے کہ جس زمانہ میں سالار شاہو کاہیر سے ستر کھ کی جانب متوجہ ہوئے اس زمانہ میں اور سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت سے دو سال قبل محمود کا انتقال ہوا تھا مگر جیسا کہ ڈاکٹر ناظم صدیقی نے گردیزی - بیہقی اور کتبۂ مزار سلطان محمود کے حوالہ سے صفحہ ۱۲۴ پر لکھا ہے - محمود کا انتقال ۲۳ ربیع الآخر سنہ ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء کو ہوا یعنی سپہ سالار مسعود کی شہادت سے تین سال اور کچھ ماہ قبل -

تیسری جنگ کہاں ہوئی

اب دیکھنا یہ ہے کہ تیسری اور آخری جنگ

کس جگہہ ہوئی ۔ مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ بہرائچ سے دو کوس کے فاصلہ پر ۔ یہ ہم پیشتر دکھا چکے ہیں کہ راجگان کا جماؤ بہرائچ سے شمال میں تھا اور چونکہ سپہ سالار مسعود غازی گھاگرہ اور سرجو اتر کر آئے تھے اور بہرائچ کے شمالی حصہ میں جنگل جھاڑ تھی اس لئے موجودہ قصبہ کے جنوبی حصہ میں ان کا قیام رہا ہوگا ۔ ان باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آخری لڑائی کی جگہہ بہرائچ سے دو ڈیڑھ کوس شمال میں قرار پاتی ہے ۔ آج کل بھی مزارات شہدا کثرت سے اسی جگہہ ہیں ۔ ممکن ہے کہ اعتراض کیا جائے کہ ان مزارات کی موجودگی سے یہ کیسے ثابت ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھی شہیدوں کے ہیں ۔ ممکن ہے کہ دیگر مسلمانوں کے ہوں ۔

موجودہ مزارات واقعی ہیں یا فرضی

نو سو سال کے عرصہ میں قبروں کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے ۔ یا ممکن ہے کہ یہ مزارات فرضی ہوں ہم کو اس خیال سے اتفاق یوں نہیں ہے کہ بہرائچ کے شروع زمانہ کی مسلمانوں کی مردم شماری اور آج کل کی مسلمانوں کی مردم شماری (قریب بیس پچیس ہزار) کا لحاظ کرتے ہوئے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے قبرستان اور بھی ہیں یہ ناممکن ہے کہ یہ جملہ مزارات معمولی مُردوں کے ہوں جو اس نو سو سال کے عرصہ میں مرے کسی کو کیا غرض پڑی تھی کہ ایک بڑے رقبہ میں اور منتشر طور پر کثرت سے فرضی قبریں بنادی جاتیں ۔ تواریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ کوئی اور لڑائی اس طرف مسلمانوں سے یا مسلمانوں میں آپس میں ہوئی جس کی وجہ سے اس کثرت سے لاشوں کو یہاں دفن کرنے کی ضرورت پیش آتی ۔ علاوہ اس کے جس جگہہ یہ مزارات ہیں اُن کے قریبی جوار میں محض چھوٹا سا ایک موضع ہے جو نام کے لحاظ سے یقیناً پرانی ہندو جگہہ معلوم ہوتی ہے (موضع سنگنا پراسی) اس کے علاوہ یہ مزارات ایک وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں جو موضع مذکور کے چاروں طرف اور بہرائچ سے شمال ، شمال مشرق اور

شمال مغرب میں واقع ہیں۔ سپہ سالار مسعود غازی سید ابراہیم صاحب۔ سکندر دیوانہ وغیرہ شہدا کے جہاں مزارات ہیں وہ جگہہ قرب وجوار کے مقابلہ میں بہت نشیب میں ہے اور ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ تالاب (سورج کنڈ) تھا۔ اس جگہہ زمین کے وہ حصے جو بظاہر ہموار ہیں کھودے جاتے ہیں تو ان کے نیچے قبریں برآمد ہوتی ہیں اور ہڈیاں تک نکلتی ہیں۔ سپہ سالار مسعود غازی کے مزار کے قرب میں ایک پرانے دریا کے آثار ہیں جنھوں نے اب جھیل کی صورت اختیار کرلی ہے اور بانس کے جنگل کے آثار اب تک موجود ہیں۔

جنرل کننگ ہم اور ڈاکٹر فوہرر کی روایتیں میدان جنگ کے بارے میں

ڈاکٹر فوہرر نے جلد دوم صفحہ ۲۹۲ پر اور جنرل کننگ ہم نے اپنی سروے رپورٹ میں اس جگہہ کے متعلق جہاں سپہ سالار مسعود غازی شہید ہوئے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ ڈاکٹر فوہرر نے شہادت کا حال تو مرآت مسعودی سے لیا مگر اپنی رائے ظاہر کی کہ چوں کہ یہ جگہہ بہرائچ سے کئی منزل پر تھی اور چونکہ بہرائچ کو واپسی میں سپہ سالار مسعود غازی منزل بہ منزل ٹھیرتے ہوئے آئے اس لئے سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کی جگہہ ہتیلی عرف اسوک پور ضلع گونڈہ ہے۔

گونڈہ کی مقامی روایتیں

یہ لڑائی گونڈہ کے راجہ سوہر دھوراج سے ہوئی جس کو عام طور پر لوگ سہل دیو کہتے ہیں یہ موضع ہتیلی پرگنہ مہدیوا تحصیل طرب گنج ضلع گونڈا میں ہے اور گونڈہ سے جنوب مشرق میں ۱۲ میل پر ہے وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ وہ سپہ سالار مسعود غازی کے بھانجے ہٹیلہ نامی کے نام پر آباد ہوا اور یہ کہ ہٹیلہ اس لڑائی میں مارے گئے جو اسوک ناتھ کے مندر پر ضلع گونڈہ میں ہوئی اور یہ کہ ہٹیلہ اور ان کے عزیز سیف الدین کے مزار پر لوگ ان کو شہید سمجھ کر ہیت آتے ہیں

ڈاکٹر فوہرر اور جنرل کننگ ہم نے ان پڑھ جاہلوں کی زبانی جو قصے افسانے سُنے وہی اپنی رپورٹوں میں درج کر دئے اور لطف یہ ہے کہ جو مندرجۂ بالا قصہ ضلع گونڈہ کی بابتہ درج کیا وہی دُہرا کر ضلع بہرائچ کی بابت بھی درج کر دیا۔ مرآت مسعودی میں تو کہیں بھی یہ درج نہیں کہ سپہ سالار مسعود غازی منزل بہ منزل میدان جنگ تک پہونچے اور کئی منزلوں پر قیام کرتے ہوئے میدان جنگ سے بہرائچ واپس آئے اور نہ مرآت مسعودی سے یہ ثابت ہے کہ سپہ سالار موصوف کی کوئی بہن تھی اور ان کی اولاد نرینہ ہٹیلا کے نام سے مشہور تھی۔ البتہ بہرائچ میں سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھی اور کوتوال فوج میاں رجب ضرور ہٹیلا کے نام سے مشہور ہیں اور جہاں ان کا مزار قصبہ بہرائچ کے قریب ہے وہ موضع بھی ہٹیلہ کے نام سے مشہور ہے۔ ڈاکٹر فوہرر اور جنرل کننگ ہم نے دونوں ضلعوں کی مقامی روایتوں کو خلط ملط کر دیا۔ ڈاکٹر فوہرر کی روایت کی صحت کا اندازہ ناظرین اس سے کر سکتے ہیں کہ صفحہ ۲۹۳ پر موضع دیوکلی واقعہ تحصیل قیصر گنج ضلع بہرائچ کی بابت لکھ مارا کہ یہاں امیر نصر اللہ خاں کا مزار ہے جو سلطان محمود غزنوی کے چھوٹے بھائی تھے اور جن کو فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں سپہ دار طوس کے نام سے یاد کیا ہے واہ رے زرخیزیٔ دماغ یہ ضرور ہے کہ ابوالمظفر امیر نصر بن سبکتگین سلطان محمود کا چھوٹا بھائی تھا مگر ان اطراف میں ان کا آنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے بلکہ بقول گردیزی اس کا انتقال ۴۱۲ھ / ۲۲-۱۰۲۱ء میں ہو گیا تھا جب کہ سپہ سالار مسعود غازی سات آٹھ سال کے تھے اور وہ اس طرف آئے بھی نہ تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بقول مرآت مسعودی کے سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھیوں میں ایک امیر نصر اللہ بھی تھے ممکن ہے کہ وہ اس طرف آئے ہوں یا ستر کھ سے آتے وقت یہاں رہ گئے ہوں کیوں کہ دیوکلی دریائے گھاگرہ سے قریب اور اس شاہراہ عام سے قریب ہے جو ستر کھ بارہ بنکی سے بہرائچ کو آتی ہے۔

سورج کنڈ کننگ ہم صاحب نے سورج کنڈ کو بھی ضلع گونڈہ میں اس وجہ سے بتادیا

کہ وہاں بھی ایک سورج کنڈ ملا - حالاں کہ یہ ایک عام لفظ ہے اور ہر ایک ایسے تالاب کو جہاں آفتاب کی پرستش کا بتخانہ تھا سورج کنڈ کہا جاتا ہے چنانچہ ایسے سورج کنڈ بہت سی جگہہ موجود ہیں - مثلاً تحصیل نان پارہ ضلع بہرائچ میں - بدایوں کے قریب - شہر میرٹھ کے قریب لکھیم پور کھیری اودھ کے قریب - سنبھل ضلع مرادآباد میں - البیرونی (ترجمہ صفحہ ۱۴۵) پر کہتا ہے کہ اس زمانہ میں کہ اکثر مقدس مقامات ہندو نہانے کے لئے بڑے بڑے تالاب بناتے تھے - البتہ ڈاکٹر فوہرر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ راجہ گونڈا کا اصلی نام سوہر دھواج تھا جس کو بگاڑ کر لوگوں نے سہل دیو کر دیا - اس سے مرآت مسعودی کے راجگان کے ناموں میں ایک خاص نام کی تائید ہوتی ہے - ان مقامات کا خاکہ ذیل کے نظری نقشہ سے معلوم ہو جائیگا

نقشہ بہرائچ و ملحقات و میدان جنگ
سرحد ضلع لکھیم پور
شمال
جنوب
مشرق
مغرب
بہرائچ
جنگل
دریائے راپتی
دریائے سرجو
دریائے گھاگرہ
سرحد ضلع بارہ بنکی
ضلع بارہ بنکی
ریلوے لائن بی این ڈبلیو
گونڈہ
کانپور
لکھنو
گورکھپور
سرحد ضلع گونڈہ

بہرائچ کی مقامی روایتیں

بہرائچ خاص کے علاوہ بھی ضلع میں جگہہ جگہہ سپہ سالار مسعود غازی کے رفقا کی بابت مقامی روایتیں ہیں چنانچہ امیر نصر اللہ اور میاں رجب اور سالار سیف الدین کی بابت ہم لکھ چکے ہیں۔ دیگر حضرات کے متعلق بھی اختصار کے ساتھ عرض کرنا ضروری ہے۔ سپہ سالار موصوف کے مزار کے قریب ہی ایک مزار کالو شہید کا مشہور ہے کیا تعجب ہے کہ یہ وہی ملک کالو افغان ہوں جنھوں نے محمود کو مدد دی اور جنھوں کا ذکر مخزن افاغنہ کے مترجم ڈورن نے اور ریاض المحبت اور وینسی ٹارٹ (Wansitart) نے کیا ہے جیسا کہ ہم نے یہ سلسلہ نسب سپہ سالار مسعود غازی اوپر دکھایا ہے۔ بہرائچ کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر اور ڈاکٹر فوہرر نے ان مقامی روایتوں کی بنا پر لکھا ہے کہ بہرائچ تحصیل قیصر گنج ضلع بہرائچ میں سپہ سالار مسعود غازی کے ایک رفیق بہرام کا مزار تھا جو ۱۸۷۶ء میں دریائے گھاگرہ کے سیلاب سے تباہ و برباد ہو گیا حسام پور پرگنہ قیصر گنج کی بابت لکھا ہے کہ اس کو سپاہ سالار مسعود غازی کے ساتھی حسام الحق نے بسایا۔ اگرچہ اسی کے ساتھ اس خیال کو بھی ظاہر کر دیا کہ یہ ملک حسام الدین تغلق کا آباد کیا ہوا ہے جو ۱۲۴۰ء میں بادشاہ دہلی کی طرف سے اودھ کا حاکم تھا۔ سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد ان کی حیات کا ڈراما تو ختم ہو جاتا ہے مگر اس کے متعلق ہم کو چند سین اور دکھانے ہیں ورنہ تاریخ نامکمل رہے گی۔

باب پنجم

سپہ سالار مسعود غازی کے عادات خوارق اور ان کا درجہ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حتی المقدور سپہ سالار مسعود غازی کے عادات اور خوارق پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ ورنہ محض چند لڑائیوں اور مقامات کے حالات لکھ دینے سے ہمارے نوجوان اور بادۂ محبت لم یزل کے سرشار سے پوری کیفیت

نہ ہو سکے گی۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو محض واقعات سن کر صحیح نتائج اخذ کریں
زیادہ تر اصحاب دوسروں سے نتائج معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے اب تک مندرجۂ
بالا سطور میں جو حالات تھوڑے بہت درج کئے انھیں سے سپہ سالار مسعود غازی کی
اندرونی اور بیرونی زندگی اور عادات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا ظاہر اور باطن یکساں تھا ورنہ
شاید اس وقت جب کہ محمود نے ان کو ہندوستان چلے آنے کا اشارہ کیا وہ اپنی ناخوشی
کا اظہار نہ کرتے۔ ایسا آدمی ہمیشہ صاف گو ہوتا ہے اور سچ بات کے اظہار سے
کبھی دریغ نہیں کرتا خواہ وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔ وہ نہایت بہادر اور شجاع
تھے ورنہ ایک شخص سے جس نے بچپن اور لڑکپن عیش و عشرت میں گذارا ہو یا ایسی حالت
میں گذارا ہو کہ ان کی بالک ہٹ کو پورا کرنے کے لئے چاروں طرف خدام موجود تھے یا
بادشاہ کے مقرب اور عزیز افسر کا اکلوتا بیٹا ہو، کوئی تعجب نہ ہوتا اگر وہ آرام طلب
سُست یا بزدل ہوتے۔ مگر بقول شخصے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ تیرہ چودہ
سال کی عمر ہی میں اُنھوں نے ہاتھ پیر نکالے اور اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو کر پُرہیبت
پہاڑوں۔ خطرناک دریاؤں۔ صدہا میل کی مسافتوں۔ مخالفین کی رکاوٹوں اور سب سے
بڑھ کر ناتجربہ کاری کی مصیبتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے تبلیغ کی کٹھن راہ میں چل کھڑے
ہوئے اس سے زیادہ بہادری اور شجاعت کیا ہو سکتی ہے۔ پھر بہرائچ کی لڑائیوں
میں جان نثار رفقا نے ان کے سامنے میدان میں تڑپتے ہوئے بے یار و مددگار وطن
سے دور اور غیر کفو کے جھرمٹ میں اپنی جانیں دیں۔ معمولی قلب اور ہمت کے آدمی کے
لئے یہ خوفناک منظر کافی تھا۔ مگر جب ان کے ساتھیوں کی تعداد ایسی رہ گئی جیسے آٹے
میں نمک تو بھی وہ یہی کہتے رہے کہ "ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم" کلمۃ اللہ
کے ابلاغ سے اس وقت بھی مُنہ نہ موڑا۔ اس سے ان کی ہمت و استقلال پر بھی روشنی
پڑتی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے اچھے برتاؤ اور خوش خلقی سے صدہا ساتھیوں

کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور پروانوں کے لئے ایک شمع بنے ہوئے تھے مگر پھر بھی خود رائی کو کبھی کام نہ لیا۔ حالات مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مشکل اور نازک موقعوں پر ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور مشورہ پر چلے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاید بہرائچ کے ہندو راجاؤں کو صلح و آشتی کا پیام نہ دیتے اور ان کے اس اصرار پر کہ سپہ سالار مسعود غازی بہرائچ سے چلے جاویں یہ جواب نہ دیتے کہ عارضی صلح کا عہدنامہ کر لیا جاوے اور وہ شکار کھیلنے کے بعد چلے جاویں گے باوجود اس جاہ و جلال اور حکومت کے انصاف کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ اور جب راجگان میرٹھ اور قنوج نے ان کے ساتھ نرمی اور انسانیت کا برتاؤ کیا تو انھوں نے بھی ان راجگان سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کی بلکہ وہ آگے بڑھ گئے اور ایسی صفت کی جھلک اس جواب میں نظر آتی ہے جو انھوں نے کوہ حملہ کے زمیندار جوگی داس کو بھیجا۔ البتہ جب وہ مجبور ہو گئے تو سیاسی ضرورتوں اور عدل کی بنا پر انھوں نے بعض دفعہ اپنے یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ زیادتی اور سختی کرنے والوں کو سزا ضرور دی جیسا کہ قصبۂ راول کے راجہ شیوگن یا شیوگن شاہ والے قصہ سے ثابت ہے بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ عدل سے فضل کا درجہ بالاتر ہے اور جب کہ سیاسی ضرورتیں مجبور نہ کریں تو بجائے سزا کے چشم پوشی اور عفو زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں بعض مرتبہ سپہ سالار موصوف نے اسی اصول کو مدنظر رکھا جیسا کہ مرآت مسعودی کے اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے جو حجام اور زہر آلود ناخن تراش کی بابت ہے۔ اس موقعہ پر خود انھوں نے اپنے والد سے سفارش کی کہ اس گستاخ حجام کا جو دوسروں کے بہکانے میں آگیا قصور معاف کر دیا جائے

سیر چشمی اور فیاضی اُن کی خاص عادت تھی جو کچھ ملا ہمیشہ ساتھیوں کے نذر کیا۔ یہاں تک کہ شہادت سے قبل اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب خیرات کر دیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر انسان ایسی حالت میں فیاضی اور سیر چشمی سے کام نہ لے تو شاید اس کے پاس کوئی پھٹکے بھی نہیں غالباً یہی وجہ تھی کہ مرکزی حکومت سے دوری اور اس سے امداد ملے ہوئے بغیر کافی جمعیت سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھ ہو گئی۔ ممکن ہے کہ خیال کیا جائے کہ لوٹ مار کا لالچ اور دولت کمانے کی ہوس نہ کہ سپہ سالار مسعود غازی کی فیاضی تھی جو جوق جوق جنگجو لوگوں کو ان کی خدمت کے لئے لائی مگر یہ خیال اس وجہ سے غلط ہے کہ لوٹ مار اور غارت گری اور آتش زدگی کے کوئی حالات ہم کو مرآت مسعودی یا دیگر تاریخوں سے نہیں ملے یہ دوسری بات ہے کہ محض اس خیال سے کہ انھوں نے غزوات کئے۔ دوسروں کے ملک میں مداخلت کی اور لڑائیاں لڑیں کوئی اُن کو یہ بھول کر کہ دوسروں نے بھی ایسا کیا ہے لوٹیرے اور ڈاکو کے نام سے پکارنے لگے ممکن ہے کہ لڑائیوں میں کچھ مال غنیمت ان کی فوج کے ہاتھ میں آیا ہو مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُن سے احمد نیال تگین کی سی حرکت سرزد ہوئی ہو۔ بخلاف اس کے اُن کی ایمان داری، انصاف اور راست بازی اس واقعہ سے بخوبی ثابت ہے کہ جب ان کو غلّہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو مفت نہیں لیا بلکہ قیمت ادا کی اور باوجود فروخت کرنے والوں کے اصرار کے پیشگی ادا کی ورنہ جنگ کی حالت میں تو فوج کا پیٹ ہر طریقہ سے بھر نا دینا نے جائز رکھا ہے۔ دنیاوی دولت کی ناپائداری اور دنیا کے دوں کی بے ثباتی وہ اچھی طریقہ سے جانتے تھے ورنہ وہ اپنے رفیقوں کے اس مشورہ کو نہ ٹھکرا دیتے کہ مرکزی حکومت کی دوری دیکھتے ہوئے ان کو خود مختار یا وشاہ بن جانا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مرکزی حکومت کو احمد نیال تگین یا دوسرے افسران کی طرح سے کم از کم بہت زیادہ دق اور پریشان کر سکتے تھے مگر اس کا کبھی خیال بھی دل میں نہ آیا بلکہ یہی

فرمایا کہ سلطنت بادشاہ کو مبارک رہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ مرکزی حکومت نے کبھی اُن سے
تعرض نہ کیا اور نہ احمد نیال تگین یا آصف تگین سالار کی طرح سے اُن کی گرفتاری کے
لئے فوج تعینات کی یا اُن کو واپس بلانے کی کوشش کی حالاں کہ سپہ سالار موصوف کے
خاندان اور احمد ابن حسن میمندی سے جو دوبارہ محمود کے انتقال کے بعد وزیر ہوا مخالفت
تھی مگر بادشاہ اور بادشاہ کے وزیر جانتے تھے کہ سپہ سالار مسعود غازی کا خاندان ہمارے
لئے خطرناک نہیں ہے اور وہ تبلیغ کے کام میں مصروف ہے۔ محمود کی صحبت اور سومنات
کے حملہ کی شرکت نے ان کو باوجود کم عمری کے ایک کامیاب فوجی افسر بنایا ورنہ دہلی
اور بہرائچ کی لڑائیوں میں وہ مخالفین کے جم غفیر کے مقابلہ میں اتنا بھی نہ ٹھیر سکتے
اور پہلی لڑائی ہی میں ان کا قلع قمع ہو گیا ہوتا۔ ان کی رواداری اور تعصب سے بریت
اس روایت سے بخوبی ثابت ہے جو کہ پالارکھ بُت کے نہ توڑے جانے کی بابت ہے
اس میں نہ محض غیر متعصبانہ برتاؤ کی جھلک ہے بلکہ سپہ سالار مسعود غازی کا یہ فعل اُن کی
دوربینی اور مصلحت اندیشی پر بھی روشنی ڈالتا ہے ان کی پوری داستان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے
کہ اگرچہ وہ دوسروں کے حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے مگر اپنی طرف سے پیش قدمی
کبھی نہیں کی۔ تعصب کا الزام بعض دفعہ ہٹ دھرمی سے لگایا جاتا ہے اور ہر جائز طریقہ
سے تبلیغ یا شدھی کا نام تعصب رکھ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ
دنیا کے پردے پر تعصب کا اظہار کبھی نہیں ہوا یا متعصب لوگ نہیں گذرے۔ ہندو، مسلمان
عیسائی۔ بدھ۔ سکھ۔ غرضکہ ہر ملت و مذہب میں اس قسم کے لوگ گذرے ہیں اور اُن کی
حرکتیں قابل افسوس ہیں ہم ان کی طرف سے چشم پوشی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں لیکن کسی
شخص پر اس قسم کا الزام لگانے کے لئے اس کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے اور
اس کے ماحول اور فضا کا اس کی طبیعت پر اثر دیکھنا چاہئے اور پھر رائے قائم کرنا چاہئے
علاوہ بریں سپہ سالار مسعود غازی اپنے مذہب کے پابند تھے۔ مذہب اسلام نے کھلم کھلا

تعصب کو منع کیا ہے جیسا کہ ہم پیشتر ظاہر کر چکے ہیں قرآن مجید میں لا اکراہ فی الدین یعنی مذہب میں جبر نہ ہونا چاہیئے) موجود ہے ۔ خود حضرت رسول خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں رواداری کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں سے ایک بڑی مشہور مثال یہ ہے کہ جب نجران (Najran) کا عیسائی وفد حضرت رسول خدا کی خدمت میں پولیٹیکل مشن پر حاضر ہوا تو حضرت نے اس کو اپنی مسجد کے صحن میں اپنی نماز ادا کرنے کی اجازت دی ۔ اسی طریقہ سے بنی امیہ کے خلیفہ بغداد عبدالملک کے زمانہ میں یوحنا کے گرجے میں جس پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت تھی ۔ نصف میں مسلمان نماز پڑھتے تھے اور نصف میں عیسائی (ملاحظہ ہو کتاب تمدن عرب مصنفہ جوزف ہیل جرمن ترجمہ انگریزی مسٹر ایس خدا بخش پٹنوی مطبوعہ کیمبرج صفحہ ۴۴) ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں پھر اسلامی مساجد میں تو غیر مذہب والوں کے آنے تک کی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ ان کا احترام کیا جاوے ۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے بعض بادشاہوں نے تنگ دلی اور تنگ نظری سے کام لے کر مندر کو توڑا یا بعض ہندو راجگان نے مساجد کو مسمار کیا ۔ مگر ایسی حرکتوں سے ایک کے مذہب اور دوسرے کے دھرم پر حرف نہیں آسکتا اور نہ یہ سمجھا جائے گا کہ ہر مسلمان اور ہر ہندو ایسا ہی ہوگا ۔ انسان کا خاصہ ہے کہ ایک برائی کے پیچھے سو بھلائیوں کو بھلا دیتا ہے ۔ آج بھی ہندو ریاستوں میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا ہو رہا ہے نہیں ہو رہا یا مسلمان ریاستوں میں ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا مراعتیں نہیں ہیں ۔ اچھے ناظرین ہم کو معاف کریں گے ہم کہاں سے کہاں پہونچ گئے ۔ ہمارا مطلب صرف اس قدر تھا کہ خواہ مخواہ سپہ سالار مسعود غازی کی بابت تعصب کا الزام لگانا ہٹ دھرمی ہے ۔ اب ہم یہاں یہ عرض کریں گے کہ اگر یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ سپہ سالار مسعود غازی ہندوستان میں تبلیغ کی غرض سے نہیں آئے بلکہ پولیٹیکل مشن تھا، تو بھی ان کے حالات، افعال، حرکات اور سکنات میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس میں بمقابلہ دیگر اشخاص کے جن کی آمد کی اغراض ملک گیری یا پولیٹیکل میں زیادتی ہو ۔ ہندوستان پورے طور سے تہذیب

اور تمدّن کے دائرہ میں شریک بھی نہ ہو پایا تھا کہ اس پر بیرونی حملے شروع ہو گئے جیسا کہ ہڑپا ضلع مانٹ گومری پنجاب کے موجودہ انکشافات سے معلوم ہوتا ہے یا جس کا ثبوت وسطی ایشیا کی آرین قوم کے حملوں میں ملتا ہے۔ جب آرین قوم کے پیر یہاں جم گئے تو بقول مورخین بارہویں صدی عیسوی تک بیچارے ہندوستان پر حملے ہی حملے ہوتے رہے انڈوسیدین قوم۔ یونانی قوم۔ ساکا لوگ ہونہ کشان قوم۔ ترک۔ افغان۔ الغرض کون تھا جو اس سونے کی چڑیا کو پکڑنے کے لئے نہ آیا۔ پھر یہ ستم ظریفی کہ بعض دفعہ خود ہندوستانیوں نے باہر والوں کو بلایا۔ پھر سپہ سالار مسعود غازی میں کونسی خاص بات تھی جو محض اس وجہ سے کہ انھوں نے ہندوستان میں غزوات کئے ان پر لوٹ مار کھسوٹ اور تعصب کا الزام دیا جاوے۔ لوٹ مار کے لئے ملتان۔ دہلی۔ بدایوں۔ ستر کھ اور بہرائچ میں کیا رکھا تھا۔ سپہ سالار مسعود غازی نے بالارکھ کے بُت کو توڑنے سے منع کیا ہے اس سے ہم نے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ سومنات کے بت کو چونہ کر کے ہندوؤں کو کھلانے کی بابت جو قصہ مرآت مسعودی میں درج ہے وہ محض غلط اور من گھڑت ہے۔

سپہ سالار مسعود غازی کو درجہ ولایت حاصل تھا یا نہیں

اب یہاں ایک بڑی دلچسپ بحث پیش آتی ہے جس کی بابت کئی ایک حضرات نے ہم سے سوال کیا آیا سپہ سالار مسعود غازی محض شہید تھے یا مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے ان کو درجۂ ولایت بھی حاصل تھا۔ یہ اعتقادیات کا سوال ہے غیر مسلم حضرات نے بلکہ مسلمانوں کے ایک فرقہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد نہ کسی کو ولی مانا اور نہ مانیں۔ ایسے حضرات اس قسم کی باتوں کو جو اولیاء اللہ سے ظہور میں آتی ہیں مافوق العادت سمجھتے ہیں اور بعض دفعہ اُن کے ماننے سے منکر ہوتے ہیں۔ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ہم خود اپنے آپ کو اس مسئلہ پر بحث کرنے کا اہل اس وجہ سے نہیں سمجھتے کہ نہ عالم ہیں نہ فاضل اور نہ ولی۔ مگر اس

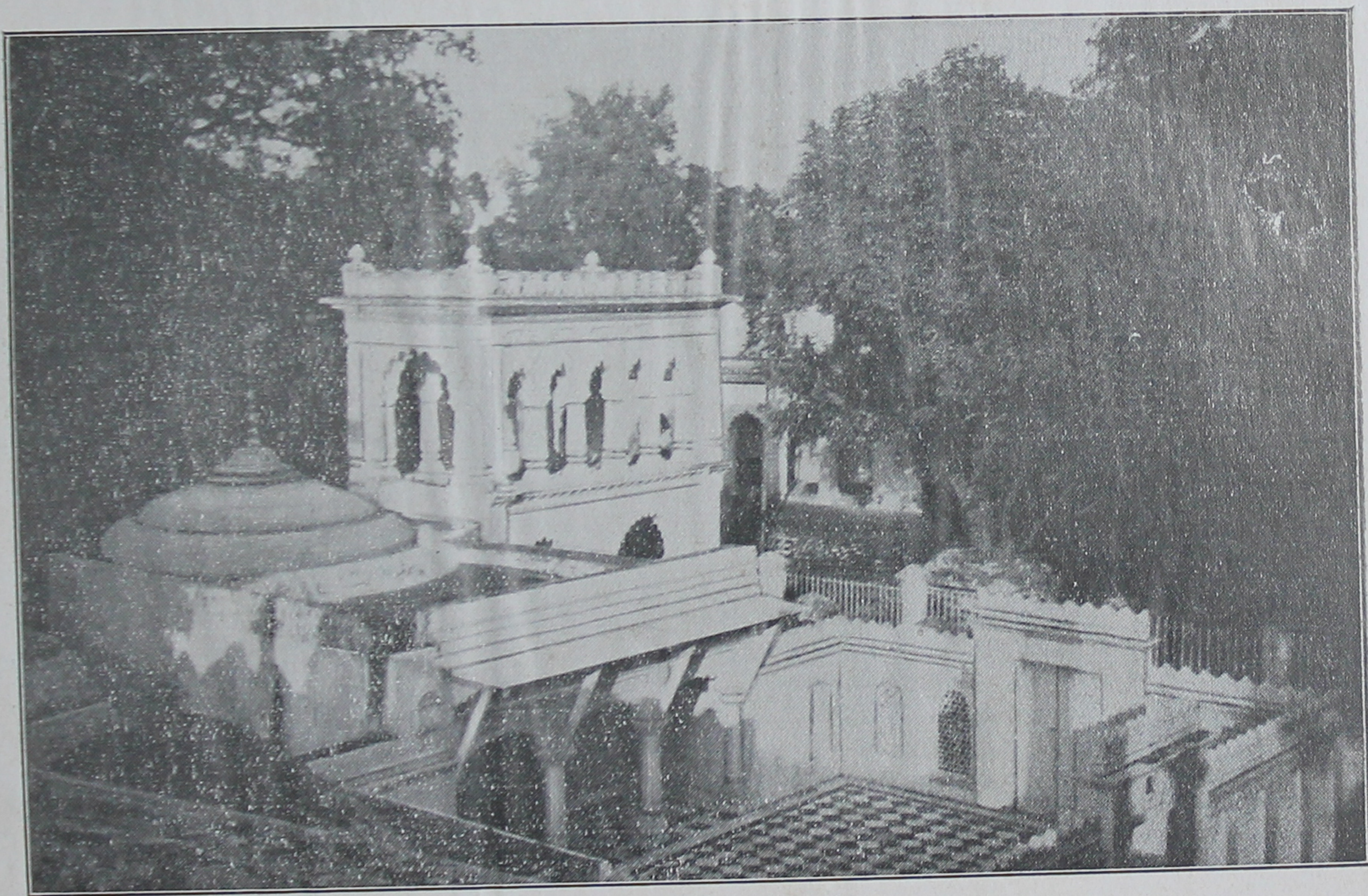
بارے میں چند روایات کی نقل دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ محمود غزنوی خود مسلمان فقرا اور اولیا رکرام کا ماننے والا اور معتقد تھا۔ اور اپنے مذہب میں پکا جیسا کہ ڈاکٹر ناظم صدیقی نے صفحہ ۱۵۹ پر بحوالہ بیہقی و تذکرۃ الاولیا حضرت فریدالدین عطار و فرخی وغیرہ لکھا ہے۔ وہ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ اور حضرت ابوسعید عبدالملک بن ابو عثمان محمد بن ابراہیم الفرگوشیؒ کا بہت معتقد تھا۔ نفحات الانس مولانا جامی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو محمد چشتیؒ محمود کے ہم عصر تھے اور محمود ان کا لحاظ کرتا تھا۔ یہی روایت مرآت مسعودی کی بھی ہے صاف ظاہر ہے کہ کچھ تو مذہبی اثر سے اور کچھ اس خیال سے کہ اَلنَّاس علی دین ملوکھم محمود کے دربار کے لوگ اور متعلقین بھی ان بزرگوں کے معتقد ہوں گے۔ ہمارے پاس اس امر کی کوئی سند نہیں ہے کہ ان بزرگوں میں سے کسی سے حضرت سیہ سالار مسعود غازی یا اُن کا خاندان بعیت تھا یا نہیں۔ مرآت مسعودی نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ سیہ سالار مسعود غازی کا بہت سا وقت عبادت الٰہی اور علماء اور صلحا کی صحبت میں گذرتا تھا۔ سیہ سالار مسعود غازی کی پیشین گوئی کہ ان کو تا قیام قیامت سورج کنڈ پر رہنا ہے پوری ہوئی۔ اسی طرح سے اُن کی پیشین گوئی پوری ہوئی کہ جب مذہب اسلام کی ترویج ہو گی تو بت بالارکھ خود بخود یہاں سے علیحدہ ہو جائے گا۔

سیہ سالار مسعود غازی کے تصرفات اور کرامات کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں اور اُن میں سے چند کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ سب سے بڑا مشہور قصہ تو یہی ہے کہ بی بی زہرہ کو ان کے مزار پر حاضر رہنے اور دعا کرنے کی بدولت دوبارہ بینائی ہوئی۔ مرآت مسعودی کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے خود اپنی بابت یہ روایت درج کی ہے کہ سیہ سالار مسعود غازی کو انھوں نے خواب میں دیکھا اور ان کے توسل سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شمس سراج عفیف مصنف تاریخ فیروز شاہی نے لکھا ہے کہ جب فیروز شاہ تغلق کا برائچ میں قیام تھا تو بادشاہ نے سیہ سالار مسعود غازی کو خواب میں دیکھا کہ سیہ سالار موصوف نے بادشاہ

سے اس کی پیری کے متعلق اشارہ کیا اور فرمایا کہ کچھ آخرت کو سنبھالنے کا بھی کام کر لو
چنانچہ فیروز شاہ تغلق اور اس کے ساتھیوں نے سر اور چہار ابرو کا صفایا کر کے گیروا
کپڑے پہنے اور بہت سا صدقہ دیا اور خیرات کی۔ ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ
میں لکھتے ہیں کہ اکبری عہد کے مشہور بزرگ حضرت شیخ خیر الهدیہ سے کسی نے سوال کیا کہ
سپہ سالار مسعود غازی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے مختصر سا جواب دیا
کہ وہ شہید تھے۔ اس پر منتخب التواریخ کے عیسائی اور انگریز مترجم نے نتیجہ نکالا ہے کہ
شیخ خیر الهدیہ سپہ سالار موصوف کی ولایت کے قایل نہ تھے ورنہ وہ کہتے کہ ولی بھی تھے
ہماری ناچیز رائے میں اس مختصر سے جواب میں ولایت کے قایل ہونے یا نہ ہونے کا کوئی
ذکر ہی نہیں ہے دل کا حال خدا کو معلوم ہے۔ پھر مسلمانوں میں شہادت کا درجہ ہی کیا کم
ہے جو ولایت اور چاہیے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔
مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا
مزار کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں ہے اور میر سید علی توام اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے
اپنی ملفوظات میں کئی ایک روایتیں سپہ سالار مسعود غازی کی کرامات کے متعلق درج کی ہیں
سپہ سالار مسعود غازی کی بزرگی کے متعلق مرآت مسعودی نے ایک بڑی دلچسپ روایت
درج کی ہے۔ جب فیروز شاہ تغلق بہرائچ آیا تو اس نے حضرت سید افضل الدین ابو جعفر
امیر ماہ سے جو حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور اپنے وقت کے
بزرگ کامل تھے کہا کہ وہ سپہ سالار مسعود غازی کے مزار پر اس کو لے چلیں چنانچہ وہ
تشریف لے گئے بادشاہ نے حضرت امیر ماہ سے جن کا مزار بہرائچ میں ہے خواہش ظاہر کی
کہ وہ سپہ سالار مسعود غازی کی کچھ کرامت بتائیں اس پر حضرت امیر ماہ نے جواب دیا کہ اس سے زیادہ
بڑی کرامت اور کیا ہو سکتی ہے کہ تجھ جیسا بادشاہ اور مجھ جیسا فقیر ان کی دربانی کر رہے ہیں
اس پر بادشاہ جس کے دل میں چاشنیِ عشق بھی تھی بہت محظوظ ہوا۔ قبل اس کے کہ ہم اس باب

کو ختم کریں ایک ذراسی بات اور عرض کرنا ہے اس خیال سے کہ ایک گروہ مورخین کے نزدیک سپہ سالار مسعود غازی علوی تھے اور اس لحاظ سے کہ مسلمانوں میں سے ایک فرقہ کی رائے میں حضرت محمد ابن حنفیہ شیعان علی کرم اللہ وجہہ میں سے تھے اس لئے سپہ سالار مسعود غازی کا مذہب حضرات شیعہ امامیہ اثنا عشریہ بتاتے ہیں۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب میں جس کا حوالہ ہم پیشتر دے چکے ہیں جلد ۶ صفحہ ۱۱۶ اور جلد ۹ صفحہ ۸۶ پر مختلف اسناد کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے کہ حضرت محمد ابن حنفیہ کا مذہب شیعہ نہ تھا۔ مگر ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ صرف اس قدر عرض کریں گے کہ محمود غزنوی اپنے مذہب میں پکا سنی تھا۔ قرامطہ سے سخت جلتا تھا۔ عباسی خلفائے بغداد سے اس کے تعلقات تھے۔ ایسی حالت میں محمود کے مقربین کی بابت یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ وہ شیعہ ہونگے علاوہ اس کے مرآت مسعودی نے بھی یہ کسی جگہہ نہیں لکھا اور اگر سپہ سالار مسعود غازی افغانی النسل تھے جیسا کہ دو ایک مورخوں نے لکھا اور جس کا قیاس بھی ہے تو ایسی حالت میں ہرگز ان کی بابت شیعہ ہونے کا خیال نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال وہ شیعہ ہوں یا سنی دونوں کے لئے واجب التعظیم تھے اور اُن کی زندگی سب کے لئے سبق آموز تھی ہم پھر یہی کہیں گے کہ ؎

یک چراغ ست دریں خانہ واز پرتو آں
ہر کجا مے نگرم انجمنے ساختہ اند



بلندی سے عمارات مزار شریف کی تصویر (مقابل صفحہ ۱۲۵)
(بارہ دری اور صحن قبہ مزار اقدس)

باب ششم

سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد ان کا مزار بہرائچ میں کیسے قائم رہا۔ مزار کی تعمیر، اس کا انتظام، میلہ عرس

اب قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب سپہ سالار مسعود غازی شہید ہو گئے اور بہرائچ پر پھر ہندو راجاؤں کا تسلط ہو گیا۔ سپہ سالار مسعود غازی کا مزار یہاں کیسے قائم رہ گیا۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے جو کسی قدر تفصیل کی محتاج ہے۔ اس سوال کا تعلق اس بحث سے ہے کہ سلطان محمود کے انتقال کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلمان تھے یا نہیں۔ اس پر ہم پہلے بھی روشنی ڈال چکے ہیں مگر یاد تازہ کرنے کے لئے مختصر طور سے چند ضروری امور کو یہاں دہرائیں گے۔ محمود کے زمانہ میں اور اس کے عین مابعد مسلمانوں نے اپنی بستیاں جگہہ جگہہ شمالی ہندوستان میں قائم کر لی تھیں۔ سپہ سالار مسعود غازی کے غزوات سے ان بستیوں کو تقویت پہونچی اور ان میں بستی ہوئی۔ جنرل احمد نیال تگین کے بنارس والے حملہ سے ان کے قیام کو مدد ملی۔ محمود کے بعد اس کے بیٹے مسعود غازی نے بھی ہانسی حصار پر حملہ کیا اور اس کے بعد اگرچہ غزنوی حکومت اندرونی لڑائیوں اور بیرونی جھگڑوں کی وجہ سے روز بہ روز کمزور ہوتی گئی مگر محمود کے جانشینوں کے دماغ سے محمود کی تقلید میں غزوات کی بو باس نہیں گئی۔

محمود کے بعد غزنوی بادشاہوں نے ہندستان میں غزوات کئے

چنانچہ تواریخ سے ثابت ہے کہ مودود ابن مسعود۔ مسعود کریم ابن ابراہیم اور بہرام شاہ ابن مسعود کریم بھی غزوات کرتے رہے اگرچہ اُن کی تفصیلیں۔ مقامات اور نتائج کا آج کل بالکل پتہ نہیں ہے۔ بہرام شاہ کا آخری حملہ ۵۱۲ھ؁ ہجری میں ہوا۔ مسعود کریم جونپور تک آیا اور اسی کے نام کی غلط فہمی

کی وجہ سے بعض نے خیال ظاہر کر دیا کہ سپہ سالار مسعود غازی جونپور تک آئے طبقات ناصری منتخب التواریخ اور دیگر کتب میں ان حملوں کا مجمل اور بہت مختصر تذکرہ ملتا ہے ایلیٹ ڈاؤسن کے ترجموں میں جلد دوم صفحہ ۱۱۲ اور ۲۵۰ پر ہم کو ان حملوں کا ذکر ملتا ہے صاف ظاہر ہے کہ ترکی مارا اور تازی کا بنا والی مثل ایسے موقعوں پر ثابت ہوتی ہے آج کل بھی اگر ایک جگہہ لڑائی ہو تو قرب وجوار میں اس کی دھاک بیٹھ جاتی ہے اگر جونپور پر حملہ ہوا تو ملحقات میں یقیناً یہ خبر اور اثر پھیلے ہوں گے کہ مسلمان اب یہاں آئے۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ ان کے پرانے قصے تازہ تھے۔

ہندو راجگان سے مسلمانوں کا شمالی ہندوستان میں موجود ہونا ثابت ہے

ہندو راجگان کے ان کتبوں سے بھی ثابت ہے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کہ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ہندو راجگان ان مسلمانوں کو نکالنے کی کوشش کرتے رہے جو سلطان محمود کے بعد شمالی ہندوستان میں رہ پڑے تھے یا آتے رہے۔ گنگ دیو کرن دیو۔ گووند چندر۔ وجے چندر لکھشمادیو انور راجہ وغیرہ کے ان کتبوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کتبوں کے علاوہ اپی گرافیا انڈکا جلد نہم صفحات ۳۲۰-۳۲۱ نے قنوج کے راجہ گووند چندر کی بی بی کمار دیوی کے اس کتبہ کا ذکر کیا ہے جو بنارس کے متصل سارناتھ میں برآمد ہوا۔ اس نے لکھا ہے کہ راجہ نے بنارس کو مسلمان سپاہی کے حملہ سے بچایا کتبوں کی رو سے اس راجہ کا زمانہ سنہ ۱۱۱۴ء سے لے کر سنہ ۱۱۵۴ء تک تھا۔ غزنوی خاندان کے بادشاہوں میں بہرام شاہ ابن مسعود کریم اس زمانہ میں تھا۔ طبقات ناصری سے ثابت ہے کہ بہرام شاہ نے سنہ ۵۱۴ھ یعنی سنہ ۱۱۳۶ء کے قریب حملہ کیا۔ اس لئے کمار دیوی کے کتبہ کی یقیناً اسی حملہ سے مراد ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ بنارس تک پہونچنے کے لئے اودھ میں ہو کر راستہ تھا تو کیا ایسی حالت میں اودھ کے جملہ اضلاع اور اقطاع

میں یہ خبر نہ گونجی ہوگی کہ مسلمان اس طرف پھر آرہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حملوں میں مقامی مسلمان جو یہاں آباد تھے حملہ کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہوں گے اور انھیں کے بل بوتے پر باوجود مرکزی سلطنت کی کمزوری کے غزنوی خاندان کے تاجداران غزوات پر چل پڑتے تھے۔ ایسی حالت میں سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد بھی بہرایچ میں یا اس کے قرب میں کچھ مسلمانوں کا باقی رہ جانا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے مرآت مسعودی کی یہ روایت ہے کہ سپہ سالار موصوف کی شہادت کے بعد ان کے والد بزرگوار کے متوسلین میں سے کچھ لوگ ستر کھ میں موجود تھے اور وہ بہرائچ چلے آئے اور مزار کی درستی اور نگرانی میں مشغول رہے۔ یہاں ایک بات اور بھی قابل گذارش ہے اگرچہ اس سے ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم کسی کے اعتقاد پر حملہ کریں مگر واقعہ کا اظہار ضروری ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بہ نسبت مسلمانوں کے ابنائے وطن کے ان پڑھ طبقے میں قبر پرستی اور بزرگوں کی طرف سے گہرا اعتقاد بہت زیادہ ہے۔ ہندو بزرگوں اور رشیوں اور منیوں کے تو مزارات ہوتے نہیں بلکہ ان کو بھسم کر دیا جاتا ہے یا مقدس دریاؤں میں بہا دیا جاتا ہے ورنہ آج ان کے مزارات بھی اگر وہ تعمیر ہوتے تو ہندو پبلک کے لئے مرجع خاص و عام ہوتے ایسی حالت میں سپہ سالار مسعود غازی کا مزار بھی قایم رہ جانے میں کوئی اچنبہ نہیں ہے۔

سپہ سالار مسعود غازی کے مزار کو کس نے اور کب تعمیر کرایا

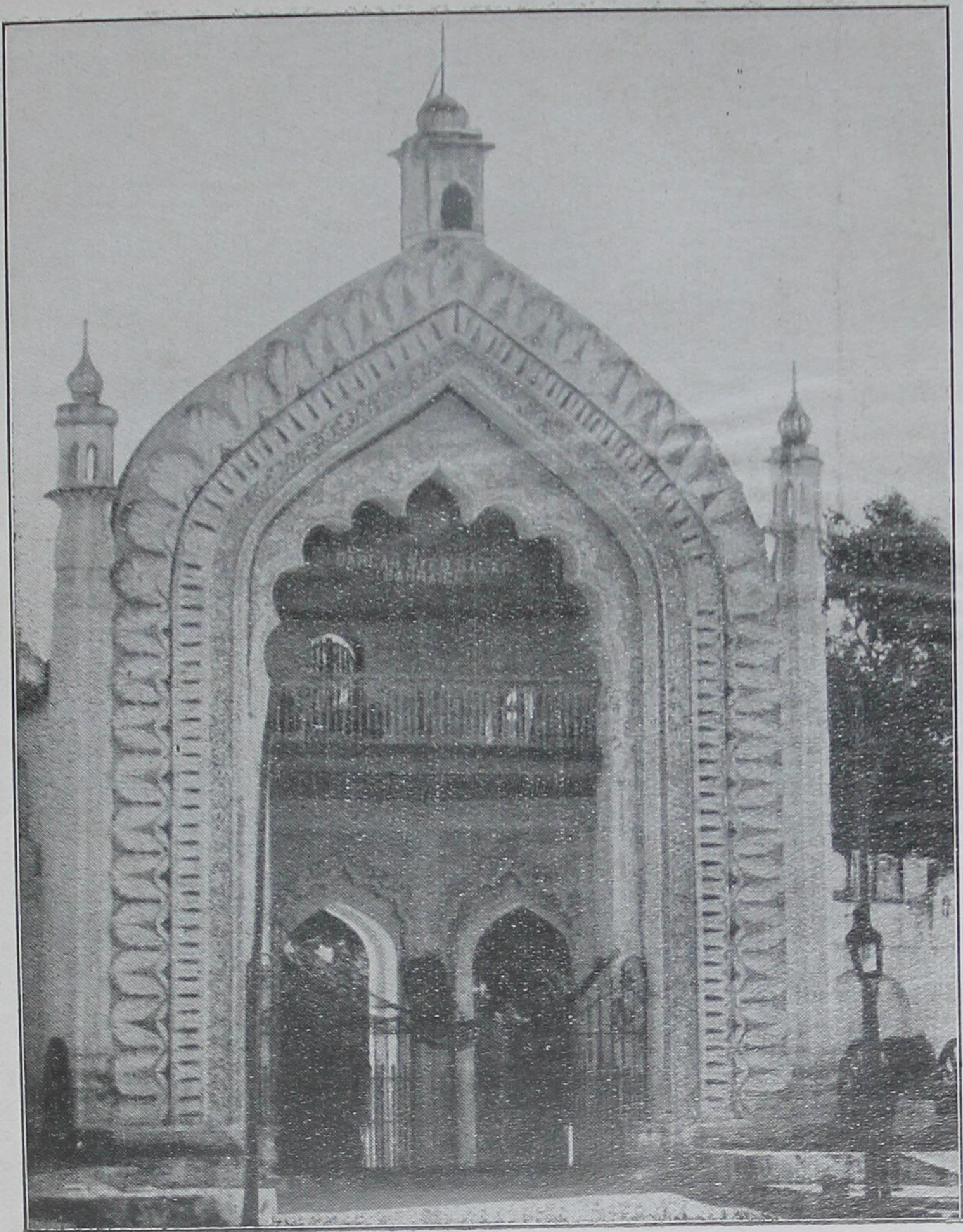
مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ سب سے اول ایک ہندو گوال نے اس مزار سے اپنے اعتقاد کا اظہار کیا۔ یہاں یہ سوال ہوگا کہ سپہ سالار مسعود غازی کے مزار کو سب سے پہلے کس نے تعمیر کرایا۔ اس بارے میں مرآت مسعودی کی روایت اگرچہ افسانہ آمیز ہے مگر چونکہ دلچسپ ہے اور ہماری اس رائے پر جو مزارات کے متعلق ہندو اعتقاد پر ہم نے پیشتر ظاہر کی ہے روشنی ڈالتی ہے اس لئے سب سے پہلے اسی

کا اظہار ضروری ہے - مرآت مسعودی نے لکھا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد اُن حضرات نے جو ستر کہہ ہیں رہ گئے تھے یہاں آکر مزار کی خدمت شروع کی اتفاق سے ملحقات بہرائچ کی گوال ذات کی ایک عورت جو اولاد سے محروم تھی یہاں آنکلی اور خدام کے مشورہ سے یہاں اس نے منت مانی - جب اس کی منت پوری ہوئی اور لڑکا پیدا ہوا تو قرب وجوار میں مزار کی برکت کا چرچا ہوا - اس عورت کے خاوند جاسو نے قبر کو بلند کیا - اس کے بعد ردولی ضلع بارہ بنکی اودھ کے ایک خاندان یعنی سید رکن الدین اور سید جمال الدین نے سب سے پہلے اس مزار پر گنبد اس یادگار میں تعمیر کرایا کہ سید جمال الدین کی بیٹی بی بی زہرہ نے جو نابینا تھیں یہاں پر قیام کیا اور مزار کی برکت سے بینائی حاصل کی - انھیں بی بی زہرہ کے متعلق عوام نے غلط طور پر مشہور کر دیا کہ سپہ سالار مسعود غازی سے ان کی شادی ہونے والی تھی - بقول مرآت مسعودی کے وہ تو شہادت کے ایک عرصہ کے بعد یہاں آئیں اور ان کا اسی جگہ انتقال ہو گیا اس لئے سپہ سالار مسعود غازی کے مزار کے قریب دفن کر دی گئیں - بہرحال مرآت مسعودی کی اس روایت کی تائید میں کوئی دوسرا تاریخی مسالہ ہم کو نہیں ملا اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ سید رکن الدین اور سید جمال الدین کون حضرات تھے - کس زمانہ میں تھے یا کس پایہ کے تھے مگر اسی کے ساتھ مرآت مسعودی کی اس روایت کو غلط ثابت کرنے کے لئے بھی کوئی مسالہ نہیں ہے تاریخی اعتبار سے سب سے پہلی روایت عمارت مزار کی بابت ابن بطوطہ میں اور پھر دونوں تواریخ فیروز شاہی میں ہے جیسا کہ ہم پیشتر ظاہر کر چکے ہیں - علاوہ ان کتب کے اور مرآت مسعودی کے ایک روایت ہے -

۲۹۲

ڈاکٹر فوہرر کا بیان

ڈاکٹر فوہرر کی آرکیولوجیکل سروے رپورٹ میں جلد دوم صفحہ پر ملتی ہے - ڈاکٹر فوہرر نے لکھا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کے مزار کی عمارت سب سے پہلے ان کی شہادت کے دو سو برس بعد سلطان شمس الدین التمش



صرف زنجیری دروازہ داخلۂ مزار

(مقابل صفحہ ۱۴۹)

کے بیٹے ملک ناصرالدین محمود نے تعمیر کرائی - محقق مذکور نے اپنے اس بیان کی تائید میں کوئی سند توپیش کی نہیں مگر یہ بیان غالباً اس وجہ سے صحیح ہے کہ ملک ناصرالدین سنہ ۶۴۱ھ میں بہرائچ کا جاگیردار اور حاکم تھا اور اسی جگہہ سے تخت نشینی کے لئے دہلی کو روانہ ہوا (طبقات ناصری - ترجمہ صفحہ ۶۶۵) عمارت دیکھنے سے پرانے طرز کی ضرور ہے اور اس ترکیب کے گنبد جیسا کہ گنج شہیداں پر بنا ہوا ہے آج کل نہیں بنائے جاتے (ملاحظہ ہو فوٹو عمارت قدیم جو اس صفحہ کے محاذ میں ہے) ملک ناصرالدین کو ضرورت نہ تھی کہ وہ غلط جگہہ پر اور فرضی طور سے کوئی مزار بنا کر مشہور کر دیتا کہ یہ سپہ سالار مسعود غازی کا مزار ہے -

ابن بطوطہ کی روایت

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ جب محمد شاہ تغلق عین الملک کی بغاوت کے بعد بانگرمئو سے بہرائچ آکر سپہ سالار مسعود غازی کے مزار پر حاضر ہوا تو مزار کا دروازہ صرف ایک تھا اور اس قدر تنگ تھا کہ ہجوم خلایق کی وجہ سے ابن بطوطہ اور بادشاہ اندر نہ جا سکے بلکہ باہر سے فاتحہ خوانی کی -

محمد شاہ تغلق کی آمد

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزار کی عمارت محمد شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے یہاں آنے سے پہلے بن چکی تھی - تاریخ فیروز شاہی ضیاءالدین برنی اور متعدد دیگر تواریخ سے معلوم ہوا کہ محمد شاہ تغلق سنہ ۱۳۴۰ء اور سنہ ۱۳۴۲ء کے درمیان بہرائچ آیا یعنی سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت سے قریب تین سو سال بعد - اس صفحہ پر پرانی عمارت کا فوٹو ہم نے دیا ہے - واقعی مزار کا حال کے زمانہ میں بھی ایک ہی دروازہ تھا - کمیٹی انتظامیہ نے سنہ میں اور ایک کھڑکی عقب میں زائرین کے آرام کے خیال سے تعمیر کرائی - مقامی روایت یہ ہے کہ موجودہ عمارت میں سے سنگ مرمر کا اندرونی حریم اور مزار کے سامنے کا دالان

اور سنگ مرمر کا فرش چھوڑ کر بقیہ عمارتیں یعنی اندرونی و بیرونی مساجد - مزار شریف کے اوپر کا گنبد اور اندرونی احاطہ کے چاروں طرف کے زائرین کے رہنے کی کوٹھریاں اور وہ دروازہ جس کو مغل دروازہ کہتے ہیں فیروز شاہ تغلق نے تعمیر کرائے -

فیروز شاہ تغلق نے کچھ عمارتیں تعمیر کرائیں

اندرونی حریم میں مزار کے سامنے اور اس سے ملحق جو دالان ہے وہ پیشتر اسی نمونہ کا لکڑی کا بنا ہوا تھا - مغل دروازہ کا مشرقی دالان کا سائبان اب بھی لکڑی کا بنا ہوا موجود ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ لکڑی کی عمارتیں فیروز شاہ تغلق بادشاہ دہلی کی بنوائی ہوئی ہیں! اور دالان مذکورۂ بالا اسی طرز اور نمونہ کا ہے جیسا کہ موضع ہٹیلہ میں میاں رجب کوتوال کے مزار کا ہے - فیروز شاہ تغلق کے تعمیر کرانے کی روایت غالباً صحیح ہے - اگرچہ اس کا تاریخی ثبوت ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ خود فیروز شاہ تغلق کی تصنیف کی ہوئی چھوٹی سی کتاب فتوحات فیروز شاہی میں درج ہے کہ اس بادشاہ نے بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں - جن میں محل، مساجد، خانقاہیں، مقبرے، چاہات پل، نہریں اور شفاخانہ اور سرائے شامل ہیں - اگرچہ بدقسمتی سے فتوحات فیروز شاہی نے بجز چند محلات کے باقی عمارتوں کے نام کی فہرست نہیں دی - علاوہ اس کے محمد شاہ تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں لکڑی کی عمارتیں بہت اچھی بنائی جاتی تھیں - چنانچہ دہلی میں محمد شاہ تغلق کے دیوان عام کی عمارت جو ہزار ستون کے نام سے مشہور تھی لکڑی کی بنی ہوئی تھی - فیروز شاہ نے فتوحات فیروزی میں یہ بھی درج کیا کہ کار خیر کے لئے اُس نے اوقاف اور جاگیریں مقرر کیں (ترجمہ فتوحات فیروز شاہی الیٹ ڈاؤسن جلد سوم صفحات ۳۸۲ لغایۃ ۳۸۵) تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف سے اور دیگر تواریخ سے ثابت ہے کہ فیروز شاہ تغلق ۱۳۷۴ء میں بہرائچ میں آ کر مزار

سپہ سالار مسعود غازی پہ حاضر ہوا ۔ اور یہاں قیام کر کے چار ابرو کا صفایا کرایا ۔ اور
خدام اور غربا کو بہت سا صدقہ اور خیرات دی ۔ مصنفہ مے ایل ڈف مسنز ڈبلیو آر ریجر
اپنی کتاب کرانو لی جی آف انڈیا میں لکھتی ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے یہاں آنے
کا سال ۷۷۶ھ مطابق ۱۳۷۴ء تھا ۔ درگاہ سپہ سالار مسعود غازی سے ملحق
ایک اور مسقف چاہ پختہ ہے جو فیروز شاہ تغلق کا بنایا ہوا بتایا جاتا ہے ۔ اگر اس پر
کوئی کتبہ نہیں ہے یہ اسی طرز کا ہے جیسا کہ بارہ بنکی لکھنؤ کے قدیم شاہ راہ عام پر
دو ایک جگہہ اور بھی ملتے ہیں ۔ اسی چاہ مسقف سے ملی ہوئی ایک خوبصورت عمارت باغ
کے اندر ہے جو قدم رسول کے نام سے مشہور ہے اور حال کے اسلامی طرز کا ایک اچھا
نمونہ سمجھی جاتی ہے ۔ یہ عمارت شاہان اودھ کے زمانہ کی ہے ۔

عمارت قدم رسول

قدم رسول کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کو دراصل
حاکم بہرائچ نے اپنے متعلقین کو رکھنے کے لئے بلا اجازت
شاہ اودھ تعمیر کرایا تھا مگر جب بادشاہ اودھ نے اس پر اعتراض کیا تو مشہور کر دیا کہ حضرت
رسول اللہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کا نشان رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے
اس وجہ تعمیر کی بابت تو ہم یقینی طور پر کچھ عرض نہیں کر سکتے ۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ یہ
عمارت شاہان اودھ کے زمانہ میں تعمیر ہوئی ۔ اور غالباً بندہ علی خاں یا مہدی علی خاں
حاکم بہرائچ نے تعمیر کرائی کیوں کہ انھیں دونوں حاکموں کے زمانہ میں خدام کی معافیات
کا اعادہ بھی ہوا ۔ اس عمارت کا فوٹو ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

درگاہ سپہ سالار مسعود غازی میں کتبہ جات

ڈاکٹر فوہرر نے اپنی کتاب کے جلد دویم صفحہ ۲۹۲ پر
لکھا ہے کہ انھوں نے درگاہ بہرائچ میں تین کتبہ جات
دیکھے یعنی ایک مسی تختی پر کھدا ہوا جو دیوار میں نصب
تھی اور دوسرا اور تیسرا درگاہ کے مال خانہ میں ۔ اول الذکر فارسی میں تھا اور اس کا منشا

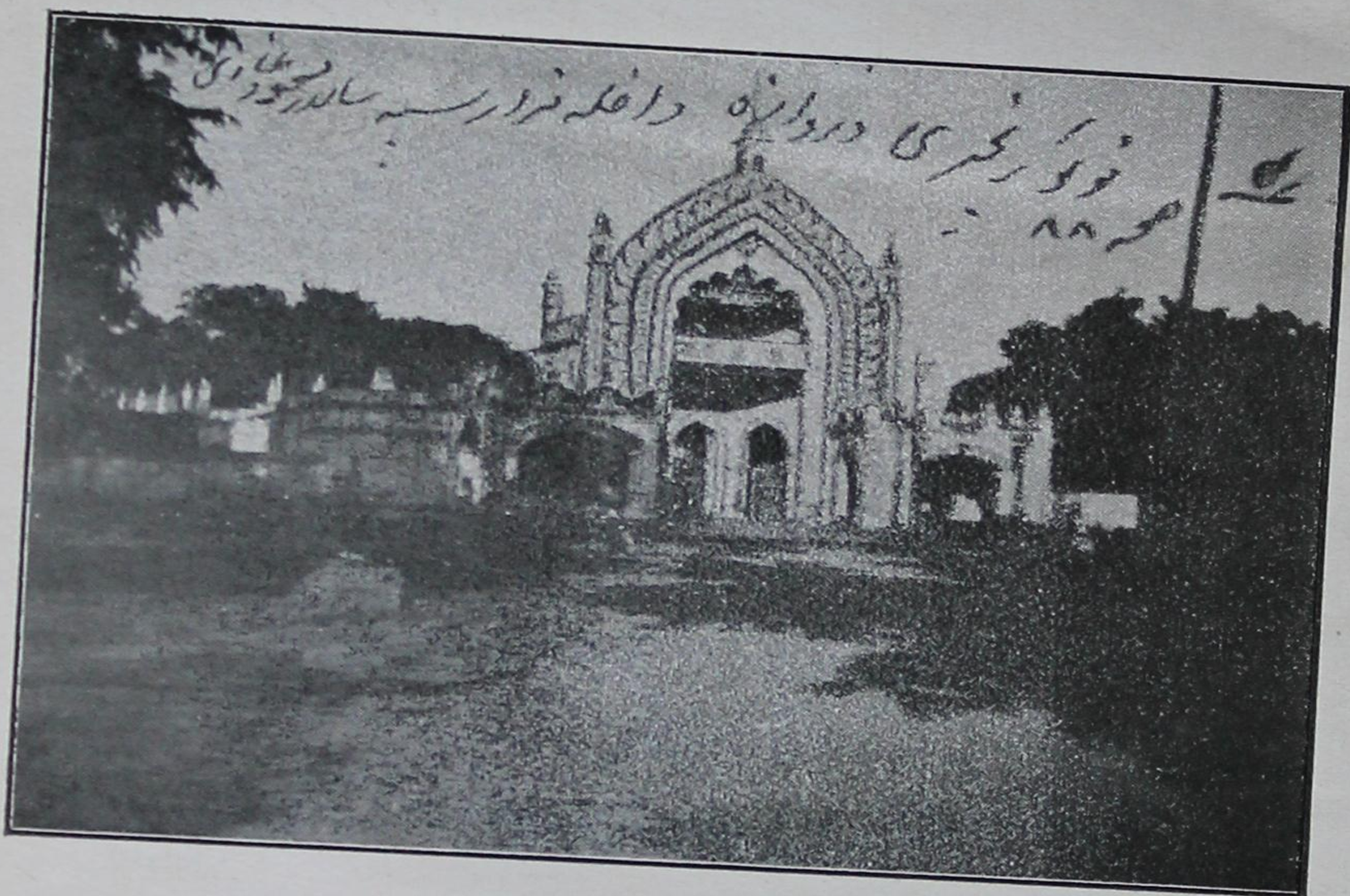
یہ تھا کہ موضع سنگھا پر اسی اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کی طرف سے درگاہ کے اخراجات کے لئے معافی میں ملا۔ اس بادشاہ کا زمانہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء سے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء تک تھا۔ دوسرے کی بابت ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ وہ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء زمانہ شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کا بندہ علی خاں گورنر بہرائچ کا تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ منیلہ کی آمدنی مزار کے اخراجات کے لئے معاف کی گئی۔ تیسرا کتبہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کا مہدی علی خاں گورنر کا تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ درگاہ کی آمدنی معاف کی گئی۔ اُن کتبہ جات کا پتہ نہیں چلا اور وہ دستبرد زمانہ کے ہاتھوں غائب ہوگئے۔

درگاہ کمیٹی نے عمارتیں تعمیر کرائیں

اسی سلسلہ میں یہ عرض کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب سے درگاہ کا انتظام ایک کمیٹی کے ہاتھ آیا اس کے بعد عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ برابر جاری ہے اور اس بارے میں مرآت مسعودی کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے کہ ایک عرصہ میں یہاں عمارتوں کی رونق بہت بڑھ جاوے گی۔ مزار شریف کے سامنے اندرونی حریم کے اندر سنگ مرمر کا دالان۔ فرش اور اس سے باہر اور بیرونی حریم کے اندر کوٹھی۔ ہسپتال۔ باغات اور زائرین کے قیام کے لئے کمرے اور مسقف بازار کمیٹی انتظامیہ نے گزشتہ پچیس تیس سال کے اندر تعمیر کرا کے رونق کو بہت بڑھا دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فوٹو عمارات جدید جو بزمانہ کمیٹی تعمیر ہوئیں)۔ سپہ سالار مسعود غازی کو اپنی حیات میں بھی باغ کا شوق تھا اور شہادت کے بعد بھی ان کی روح پُرفتوح موجودہ باغ سے لطف اندوز ہوتی ہوگی واقعہ یہ ہے کہ ؎

میرے ہی جلوہ سے ہے سب یہ چمن آرائی
نقش ہے ہر ورقِ گل پہ لطافت میری

(زہیرؔ)



زنجیری دروازه داخله مزار سپه سالار مسعود غازی

(مقابل صفحه ۱۵۲)



...عود غازی (بیرونی حریم کا در...)

(مقابل صفحہ ۱۵۲)



نعل دروازه معه صلاططنچی وغیره
(مقابل صفحه ۱۵۲)

سپہ سالار مسعود غازی کے مزار پر میلہ سالانہ

تھوڑا سا حال اس میلہ کا جو سپہ سالار مسعود غازی کے مزار پر صدہا سال سے چلا آرہا ہے، دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ میلہ جیٹھ کے ماہ میں پہلی اتوار کو ہوتا ہے مرآت مسعودی نے سورج کنڈ اور بت بالارکھ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہاں سورج گرہن اور چاند گرہن کے روز بڑا مجمع ہوتا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اب جو میلہ یہاں ہوتا ہے یہ وہی ہے جو سپہ سالار مسعود غازی کے آنے سے پہلے بھی ہوتا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ یہ اتوار کے روز اس کا خاص دن ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں اتوار کا تعلق آفتاب کی پرستش سے ہے اتوار مخفف ہے اوت وار کا جس کے معنی ہیں سورج کا دن۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میلہ زائرین ہیں جو مزار پر چڑھاوا چڑھاتے ہیں اور بڑے چھوٹے جھنڈے نذر کرتے ہیں تین چوتھائی تعداد ہندوؤں کی ہوتی ہے۔ پیشتر تو غالباً یہاں بہت سی بدعات ایسی تھیں جو مذہب اسلام کے خلاف تھیں مگر اب کمیٹی انتظامیہ نے بہت سی بدعتوں کو بند کر دیا ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اب بھی کچھ باقی ہیں۔ اس میلہ کے پرانے ہونے کا ثبوت مرآت مسعودی سے قبل کی تاریخوں سے بھی ملتا ہے چنانچہ اکبر نامہ میں ابوالفضل نے اس سلسلہ میں بڑا دلچسپ قصہ لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ ایک سال جمنا کے کنارے زائرین بہرائچ کو علم لے کر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے اور بڑا مجمع تھا اکبر بادشاہ بھیس بدل کر تماشا دیکھنے کے لئے اس مجمع میں چلا گیا اتفاق سے ایک شخص نے پہچان لیا اور اکبر کو اس شناخت کا پتہ لگ گیا۔ تو اس نے فوراً اپنی آنکھوں کی پتلیاں پھیر کر ایسی صورت بنائی کہ لوگ کہہ اٹھے کہ یہ بادشاہ نہیں ہے۔ آگے چل کر ابوالفضل کہتا ہے کہ بہرائچ میں بڑا مجمع ہوتا ہے لوگ راتوں کو جاگتے ہیں اور اچھے برے سب جمع ہوتے ہیں (آج کل بھی یہی حالت ہے اگرچہ مجمع اب کم

ہوتا جاتا ہے اور یہ کہ سپہ سالار مسعود غازی غزنین کی فوج کے شہدا میں سے تھے (ترجمہ بی وریج جلد دوئم صفحہ ۲۲۵) تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سکندر لودی بادشاہ نے جس کا زمانہ ۸۹۴ھ لغایۃ ۹۲۳ھ تھا اور جو شریعت اسلام کا سختی کے ساتھ پابند تھا۔ اس میلہ کو سختی کے ساتھ بند کر دیا تھا اور جاتریوں اور نیزوں کا لے جایا جانا ممنوع قرار دیا (تاریخ فرشتہ مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۱۸۶ و ۱۸۷) اس کی تائید تاریخ داؤدی مصنفہ عبداللہ عہد جہانگیر سے بھی ہوتی ہے (ایلیٹ ڈاؤسن جلد چہارم صفحہ ۴۴۴) اور یہی بات زبدۃ التواریخ نے بھی لکھی ہے (جلد صفحہ ۱۸۷) خافی خاں کی تاریخ منتخب اللباب سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی اس قسم کے میلوں کو بند کرنے کی کوشش کی اگرچہ خاص طور سے بہرائچ کا نام اس نے نہیں لیا۔ مگر جو رسوم خواہ اچھی ہوں یا بری صدیوں کی آبیاری سے جڑ پکڑ جاتی ہیں ان کو اکھاڑ ڈالنا آسان نہیں ہے ہاں کاٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ میلہ اب تک قائم ہے اور کم و بیش قائم رہے گا ایک عجیب بات یہ ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی کی یادگار میں اسی تاریخ اور اسی روز ہندوستان کے مختلف حصوں میں میلے ہوتے ہیں۔ مثلاً بدایوں، مرادآباد آگرہ یا ہمارے صوبہ کے کئی ایک پوربی اضلاع میں۔ یہاں تک کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد دکن کی ریاست کے ضلع گلبرگہ کے تعلقہ شاہ پور میں لوگوں نے سپہ سالار مسعود غازی کی ایک درگاہ بنا رکھی ہے اگرچہ اس روایت کی کوئی سند ہمارے پاس نہیں ہے۔ مرآت مسعودی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تصنیف کے زمانہ میں بھی اس قسم کے یادگاری میلے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہوتے تھے۔

سپہ سالار مسعود غازی کا عرس

علاوہ میلے کے ۱۲، ۱۳، ۱۴ رجب کو سپہ سالار مسعود غازی کا سالانہ عرس بھی ہوتا ہے جس میں مجمع اضلاع قرب و جوار کے مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ محافل سماع، وعظ

اور قرآن خوانی ہوتی ہے اور سپہ سالار مسعود غازی کی فاتحہ کمیٹی چند سال سے اس عرس کو ترقی دینے کی کوشش کر رہی ہے - اس سلسلہ میں ایک خاص بات قابل تحریر یہ ہے کہ

سپہ سالار مسعود غازی کے تبرکات

اس میں سپہ سالار مسعود غازی کے تبرکات بھی اٹھائے جاتے ہیں - یہاں ایک پرانے زمانہ کا لکھا ہوا اور بڑی تقطیع کا قرآن مجید ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ سپہ سالار مسعود غازی قرآن خوانی اسی سے کرتے تھے - اس قرآن مجید پر کوئی سن کتابت تحریر نہیں ہے جس سے کہا جا سکے کہ وہ کس زمانہ کا لکھا ہوا ہے اور کہاں لکھا گیا مگر ہاں کاغذ روشنائی اور رسم الخط جو خط کوفی سے ملتا جلتا ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بہت پرانے زمانے کا ہے - اسی طریقہ سے یہاں ایک مخمل کی مرزائی یا نیم آستین ہے جس پر پورا کلام مجید نہایت باریک خط میں لکھا ہوا ہے اس خیال سے کہ مرور ایام سے یہ ضایع نہ ہو جائے کمیٹی نے لکھنؤ کے کسی صناع سے اسی قسم کی نقل اور اسی طرز کے خط میں کپڑے پر کرالی ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ مرزائی شہادت کے وقت سپہ سالار مسعود غازی کے زیب بدن تھی - اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور نہ بات قیاس میں آتی ہے کہ وہ شہادت کے وقت زیب بدن ہا ہو اور اس حالت میں قائم رہے ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ان کے استعمال میں ہو اور خدام کے پاس جن کا دور دورہ کمیٹی انتظامیہ سے قبل ۱۸۶۷ء تک رہا رہی ہو بہر حال اصل مرزائی اور اس کی نقل صناعی کا اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہیں اور دیکھنے کے قابل ہیں - ڈر یہ ہے کہ آگے چل کر کسی زمانہ میں نقل اصل نہ ہو جائے - اب اور کوئی تبرکات سپہ سالار موصوف کے یہاں نہیں ہیں اگر کسی زمانہ میں تھے تو وہ ضایع ہو گئے - اس کے بعد درگاہ سپہ سالار مسعود غازی کے ذرائع آمدنی اور اخراجات کے متعلق چند سطور

بیجا نہ ہوں گی۔


درگاہ کی آمدنی کے ذرائع اور اخراجات کی مدّات

تاریخ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں تغلق بادشاہوں کی طرف سے جس طریقہ پر ہندستان کے دیگر مقامات پر مزاروں کے اور خدام کے اخراجات کے واسطے معافیاں اور جاگیریں عطا کی گئی تھیں اسی طریقہ سے یہاں بھی عطا کی گئیں اور وقتاً فوقتاً ان کا اعادہ ہوتا رہا تھا۔ یہ معافیاں خدام کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ سیاہ وسپید کے مالک تھے اور میلہ میں جو چڑھاوا ہوتا تھا یا مزار پر جو نذر و نیاز ہوتی تھیں وہ سب خدام کو۔ چنانچہ اس بارہ میں سب سے آخری شاہی فرمان جو راقم الحروف کی خدمت پریسیڈنسی کے زمانہ میں ایک غیر متعلق صاحب کے یہاں سے برآمد ہوا شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کا ہے۔ اس کی نقل ہم ناظرین کی آگاہی کے لئے ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ سنہ ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء کا ہے اور اس سے معلوم ہوگا کہ اخراجات مزار کے لئے خدام کو دس مواضعات معافی میں نواب وزیر اودھ کی جانب سے تھے۔ جس میں موضع سنگھا پراسی بھی جہاں اب مزار واقع ہے شامل تھا۔ بقیہ مواضعات اس کے قرب وجوار میں ہیں جو اب دیگر تعلقوں اور زمینداریوں میں اس وجہ سے پہونچ گئے کہ خدام نے ان کو فروخت کر ڈالا صرف ایک موضع سنگھا پراسی اب تک درگاہ کے پاس موجود ہے۔ علاوہ اس کے درگاہ کمیٹی کے انتظام کے زمانہ میں کچھ زمینداری درگاہ نے اور بھی اس خیال سے خرید لی ہے اور موقعہ ملتا ہے تو خرید لیتی ہے کہ اگر چڑھاوے کی آمدنی بند ہو جائے تو درگاہ کے مستقل اخراجات کے لئے کافی سرمایہ ہاتھ میں رہے۔ میلہ کے زمانہ میں یا علاوہ میلے کے روزانہ چڑھاوا ہوتا رہتا ہے یا بعض حضرات کی طرف سے عطیات ملتے رہتے ہیں ان سب کو اب کمیٹی لیتی ہے اور اس خیال سے کہ ہر وقت خدام کو مناسب حدود



(مقابل صفحه ۱۵۶)

شاهی فرمان



کے اندر رکھنا اور کسی قسم کی زیادتی اور جبر نہ ہونے دینا مشکل امر ہے۔ اس قسم کی
آمدنی کا خدام اور ٹھیکہ دار کی نگرانی کے شرائط کے ساتھ ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔
ان ذرائع سے درگاہ کی آمدنی قریب بیس ہزار روپیہ سالانہ کے ہے جو گھٹتی بڑھتی
رہتی ہے۔ بخلاف دیگر مزارات کے یہاں کے مصرف بہت معقول ہیں۔ خدام و بیوگانِ
خدام کو مناسب ماہانہ ملتا ہے اور ان میں سے دو شخص کمیٹی انتظامیہ میں بطور ان
کے قائم مقام کے شریک رہتے ہیں۔ مینیجر عملہ دفتر و ضلعدار وغیرہ تعنیات رہتے
ہیں۔ درگاہ کی جانب سے ہسپتال قائم ہے جس میں متوسلین درگاہ کا علاج مفت
ہوتا ہے اور شہر اور قرب و جوار کے لوگوں سے ادویہ کی قیمت نصف لی جاتی ہے۔
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم کے لئے اور دستکاری اور
صنعت و حرفت کی تعلیم کے لئے وظائف دئے جاتے ہیں۔ خدام اور متوسلین درگاہ
کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک ابتدائی تعلیم کا مدرسہ ہے۔ شہر کے اپر پرائمری، مڈل
اور عربی کے مدرسوں کو امداد دی جاتی ہے اور ایک مدرسہ درگاہ کی طرف سے حفظ
اور تجوید قرآن کا جاری ہے شہر کے غربا اور محتاجین کو ماہانہ کے طور پر امداد ملتی ہے
اور موسم سرما میں کپڑا۔ شہر کی بعض مساجد کو پیش امام اور موذن کے لئے ماہانہ
امداد دی جاتی ہے تقسیم امداد میں ہندو مسلمان سب شریک ہیں۔ عمارتوں کی مرمت
اور صفائی پر کافی روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ بعض تقاریب مذہبی یعنی رمضان، محرم
ربیع الاول، عید قرباں وغیرہ پر خیرات کی جاتی ہے۔ میلہ میں آب رسانی، صفائی
حفظانِ صحت وغیرہ پر کافی روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے عُرس اور میلاد شریف وغیرہ
پر بھی کافی روپیہ صرف ہوتا ہے۔ درگاہ میں روزانہ قرآن خوانی کے لئے حفّاظ مقرر
ہیں اور بیرون جات کے بعض فقراء کو ماہانہ امداد مقرر ہے اور روزانہ خیرات ہوتی رہتی
ہے۔ اس آمدنی اور اخراجات کے حسابات کی جانچ گورنمنٹ کے آڈیٹران کرتے ہیں اور

بعد جانچ اپنی رپورٹ قسمت فیض آباد کے کمشنر کو بھیجتے ہیں -

درگاہ کمیٹی کا دستور

درگاہ کا انتظام مسلمانوں کی کمیٹی کے ہاتھ میں ہے جس کا تعلق حکومت سے صرف اس قدر ہے کہ اس کی جانب سے دو ممبران کمیٹی نامزد کئے جاتے ہیں جن میں سے سنی المذہب سینیر ڈپٹی کلکٹر ہوتا ہے اور رواج یہ چلا آتا ہے کہ اسی ڈپٹی کلکٹر کو کمیٹی کا پریسیڈنٹ منجانب ممبران منتخب کر لیا جاتا ہے تاکہ بحیثیت سرکاری ملازم ہونے کے اس سے مدد ملتی رہے - ۶ ممبرون کا انتخاب ضلع کے مسلمان زمینداران، ممبران میونسپل و ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ سے ہوتا ہے جو تاحیات ممبر رہ سکتے ہیں - بقیہ دو ممبر خدام میں سے ہوتے ہیں جن کو کمیٹی کے ممبر نامزد کرتے ہیں - اس کمیٹی کی ہدایت کے لئے ایک قانون ضلع کے جج کی عدالت سے بنا دیا گیا ہے اور اس کے ماتحت خود کمیٹی نے اپنے واسطے قواعد ضمنی (بالائی لاز) بنائے ہیں -

اب اس داستان کے ختم کرنے سے پہلے اپنے پورے زور کے ساتھ ہم کمیٹی انتظامیہ سے عرض کریں گے کہ وہ موجودہ عمارات خاص کر لکڑی کے کام کو قائم رکھنے کی طرف پوری توجہ سے کام لے کیونکہ ان کے بعض حصے کمزور اور خراب ہو چلے ہیں ورنہ وہ اپنے فرض منصبی کے انجام سے قاصر رہے گی -

آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ ان چند سطور سے اگر کسی صاحب کے جذبات کو صدمہ پہونچا ہو تو وہ ہم کو معاف کریں گے ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نیت کسی پر بیجا حملہ کی نہیں ہے محض ایمانداری کے ساتھ اظہار رائے ضروری سمجھا - یہاں پر ہم ایک نقشہ دیتے ہیں جس سے ہندوستان اور افغانستان کے وہ مقامات معلوم ہونگے جہاں سالار ساہو اور سپہ سالار مسعود غازی گئے اور قیام کیا بعض وہ مقامات بھی اس نقشہ میں درج ہیں جہاں فوجی مشن بھیجے گئے -

تقریظ منظوم

کتاب لاجواب سوانح عمری حضرت سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ

تصنیف لطیف معدنِ لطف و احسان قلزم علم و عرفان محترم و معظم جناب صوفی

مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی ڈپٹی کلکٹر صوبہ متحدہ

رقم زدہ

فقیر بے نوا ضیاء القادری البدایونی معروف بہ لسان الحسان

زبانِ خامہ ہے صرفِ ثنائے ربِ جہاں — ہے نعتِ صاحبِ لولاک شغلِ نطق و دہاں

زہے مناقبِ اصحاب و اہلِ بیتِ رسولؐ — زہے محامد و اوصافِ اولیائے زماں

زہے وقارِ شہیدانِ فی سبیل اللہ — زہے جلالتِ اہلِ شریعت و عرفاں

صفاتِ ملّتِ اسلام اے تعالی اللہ — زہے تجلّیٔ آیاتِ عَلَّمَ القرآں

فروغِ ملّتِ بیضا وقارِ شرح مبیں — ہے اہلِ علم کا مرہونِ منّت و لعساں

طریقِ معرفتِ حق اصولِ فقر و فنا — پئے مجاہدۂ نفس ہیں دلیل و نشاں

عجب مبارک و مسعود وہ مجاہد ہیں — خدا کی راہ میں جن کے نفوس ہیں قرباں

مجاہدینِ رہِ حق کا سید و سالار — جوانِ تیغ بکف - بُت شکن - بلند نشاں

امیرِ لشکرِ محمودؒ غزنوی یعنی — شہیدِ ملّت و مسعودؒ - غازیٔ دوراں

نشانِ شوکتِ حیدرؓ شبیہ شیرِ خدا — شبابِ حسنِ محمد حنیف - والا شاں

سُرورِ سینۂ سادہوؒ جمالِ سیف الدینؒ — جلالِ شانِ ید اللہ رحمتِ یزداں

بلند حوصلہ - سالارِ فوج - فاتحِ ہند — قتیلِ عشقِ خدا قاتلِ گلوئے بتاں

وہ جس کی قوتِ بازو نشانِ فتحِ مبیں — وہ جس کی جنبشِ ابرو حریفِ تیغِ رواں

وہ جس نے ہند کی تاریخ میں کیا قائم — نیا حکومتِ مُسلم کا مستقل عنواں

وہ جس کی طیّب و طاہر حیات درسِ کمال — وہ جس کی سیرۃِ کامل صحیفۂ عرفاں

وہ جس کے فیض سے دارالفیوض ہے آج — وہ جس کی ذات سے دارالاماں ہندستاں

وہ جس کی زندگیٔ پاک کے وقائع نگار — قدیم صاحبِ دانش جدید اہلِ زباں

وہ جس کی سیرۃِ اطہر کے جامعِ اوراق — بلند مرتبہ عباس خاں رئیسِ زماں

یہ کیا بتاؤں کہ عباس خاں ہیں کون ضیا — ہیں آپ ایک وہ صوفی منش بزرگ نشاں

زمانہ آپ سے ہے روشناس مدت سے — ہیں آپ فخرِ زمانہ ہیں آپ فخرِ جہاں

ہیں آپ طبقۂ اربابِ علم و عرفاں میں — ادیبِ نکتہ رس و فاضلِ رفیع الشاں

ازل سے لائے ہیں ذوقِ ابد قرار وہ آپ — حقیقتاً ہے بقائے دوام کا جو نشاں

خدا نے آپ کو بخشی ہے دولتِ جاوید — ملی ہے آپ کو مدت سے نعمتِ پنہاں

وجود آپ کا ہے دل بیار و دست بکار — ہیں آپ صاحبِ علم و عمل بقلب و زباں

جلیل عہدہ پہ فائز ہیں آپ برسوں سے — ہیں آپ اوجِ حکومت کے نیّرِ رخشاں

شعارِ عدل ہے ذوقِ طبیعتِ والا — ہیں عقل و دانش و انصاف جزوِ طبعِ رواں

خدا نے بخشا ہے ڈپٹی کلکٹری کا وقار — ہیں آپ طبقۂ اعلیٰ کے حاکمِ ذی شاں

ہیں آپ ایک فرائض شناس صاحبِ دل — سُپرد آپ کے ہے انتظامِ امن و اماں

فلاحِ مالی و ملکی پہ آپ کی ہے نظر — غرض ہیں آپ عجب فیض بخش و فیض رساں

یہ سب مشاغلِ دنیا برائے گفتن ہیں — دراصل آپ ہیں مائل بہ جذبہائے نہاں

فقیر دوست ہیں عارف نواز صوفی ہیں — مذاقِ طبع نکو ہے تصوف و عرفاں

ہیں آپ مے کدۂ معرفت کے بادہ گسار — نظر ہے آپ کی محوِ جمالِ پیرِ مغاں

ہے کیفِ بادۂ مسعودؒ آپ کو ہر دم — ہیں آپ جرعہ کشِ ساقیٔ ریاضِ جناں

مزارِ حضرت غازیؒ سے فیض پایا ہے — ہے لطف سیدِ سالار آپ پر ہر آں

رہے ہیں مہتممِ خانقاہ بہرائچ — کیا ہے نظمِ حریمِ حضورِ خلد مکاں

سدا بہار چمن روضۂ مبارک کا — ہے آپ ہی کی عقیدت کا عطر آبر نشاں

ہے شغل آپ کا ترتیب سیرۂ مسعودؒ — کیا ہے آپ نے سر علم و فضل کا میداں

چنے ہیں پھول تواریخ کے ذخائر سے — ہے صحنِ گلشنِ تحقیق آپ کا داماں

حیات حضرتِ سالارؒ باصفا لکھ کر — کیا ہے آپ نے اربابِ ذوق پر احساں


باعتبار روایاتِ صادق و محمود — ہے لاجواب یہ تصنیف نزدِ اہلِ زباں

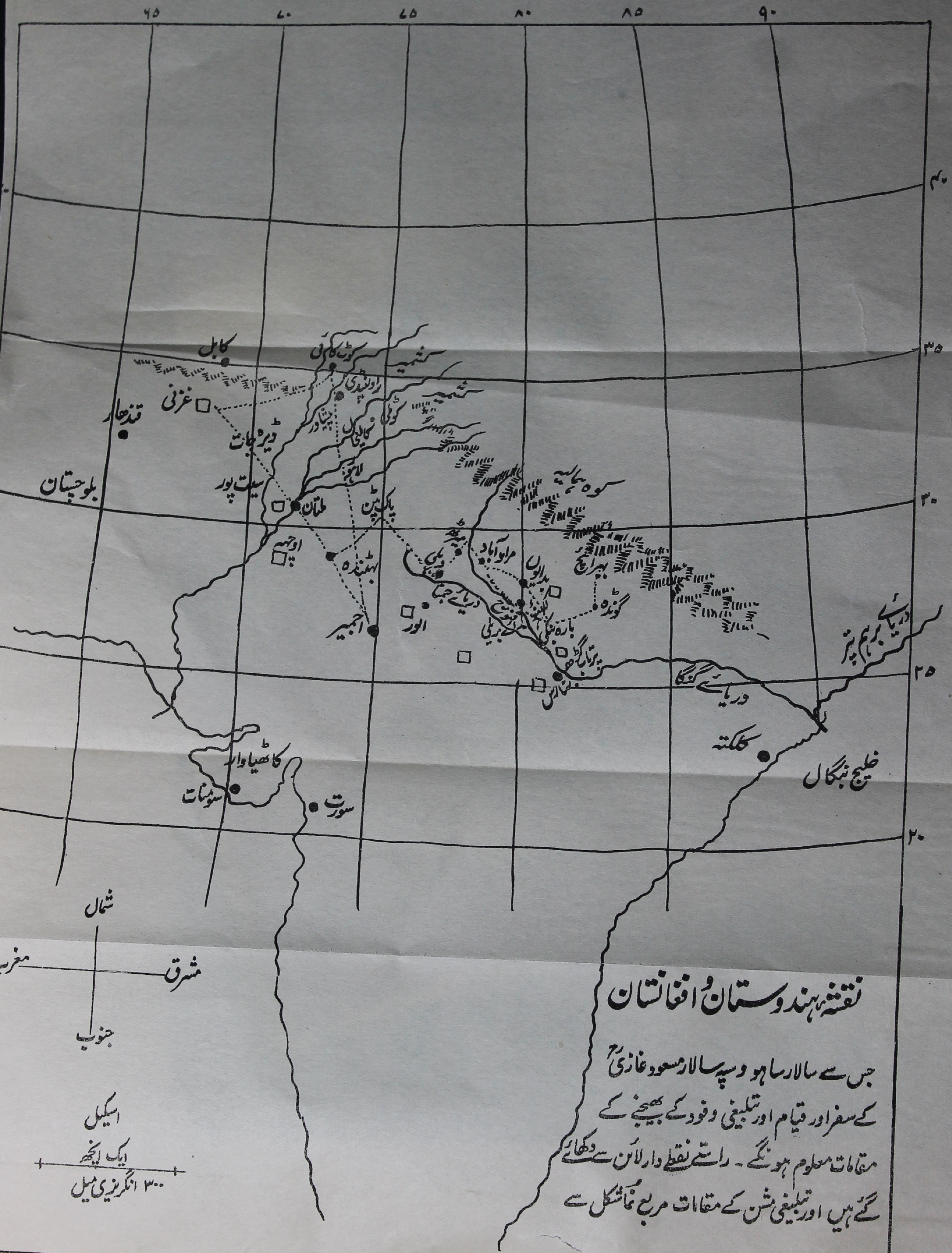
ہے دل میں شوق کہ تاریخ طبع ہو تحریر — اسی خیال میں ہے محوِ فکرِ طبعِ رواں

حیاتِ حضرتِ مسعود کو ضیاء کہئے

سوانحِ عمریِ سالار مقتدائے جہاں

۵۱ ھ ۱۳





۶۵
۷۰
۷۵
۸۰
۸۵
۹۰
۴۰
۳۵
۳۰
۲۵
۲۰
کابل
غزنی
قندھار
بلوچستان
ڈیرہ جات
سیت پور
ملتان
اوچھ
بھٹنڈہ
پاک پٹن
لاہور
راولپنڈی
پشاور
کشمیر
اجمیر
الور
دہلی
میرٹھ
مراد آباد
بدایوں
بہرائچ
گونڈہ
کوہ ہمالیہ
دریائے جمنا
بنارس
دریائے گنگا
دریائے برہم پتر
کلکتہ
خلیج بنگال
کاٹھیاوار
سومنات
سورت
شمال
مشرق
جنوب
نقشہ ہندوستان و افغانستان
جس سے سالار ساہو وسپہ سالار مسعود غازی رح
کے سفر اور قیام اور تبلیغی وفود کے بھیجنے کے
مقامات معلوم ہونگے۔ راستے نقطے دار لائن سے دکھائے
گئے ہیں اور تبلیغی مشن کے مقامات مربع نما شکل سے
اسکیل
ایک انچ
۳۰۰ انگریزی میل

فہرست اغلاط کتاب حیات مسعودی

(مسودہ کی خرابی سے اغلاط واقع ہوئیں۔ ناظرین براہ کرم درست فرمالیں)

نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح	نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح
۱۵	۵	ایلیٹ نے گئے	ایلیٹ کے	۵۹	۱۸	اسی (۸۰)	ستر (۷۰)
۱۶	۱۷	ایڈورڈ سخاؤ	ایڈورڈ سچاؤ	۶۳	۷	بن ہشام	بن سام
۲۲	۱۷	جو سنہ میں	جو سنہ ۱۷۸۸ء میں	۶۳	۱۴	رنواری	ریواری
۲۲	۱۸	اخبار الاجیار	اخبار الاجبار	۶۸	۸	رکھو	اس کو
۲۴	۹	راج راسلو	راج راسو	۶۹	۳	مسزبی وریج نے	مسزبی وریج) میں
۲۷	۱	ناقابل اعتنا	ناقابل اعتبار	۷۰	۱۲	راجہ ہرگلی	راج ترنگنی
۲۷				۷۰	۱۲	ہرراج	راج
۴۰	۱۳	ملک غازی	ملک غازی تھے	۷۲	۴	نووادی	وادی
۴۷	۱	اس میں	تاریخ میں	۸۱	۸	قنوج	قنوج میں
۴۷	آخری	ناہر	باہر	۸۲	۸	حملہ	حملہ کیا
۵۱	۳	ونسنٹ کے	ونسنٹ اسمتھ کے	۸۷	۵	کاہیر	کاہلیر
۵۲	۹	اشٹراکوٹ	رشٹراکوٹ	//	۹	//	//
۵۳	۷	سے اس نے اپنے	سے اپنے	//	۱۶	//	//
۵۷	۱	سنہ ۴۰۱ھ	سنہ ۴۰۱ھ میں	۸۸	۴	//	//
۵۷	۱۸	ترجمہ انگریزہ	ترجمہ انگریزی	۹۲	۱۲	مین بختیار	مہی بختیار
۵۸	۳	سنہ ۳۴۰ھ	سنہ ۳۲۱ھ	۹۲	۱	تیر ہندہ	تبر ہندہ

نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح
۹۷	۲	جلد دوم	جلد دوم میں
۱۰۰	۷	گھاٹ کو	گھاٹ پر
۱۰۱	۹	الودونده گڈه	دونده گڈھ
۱۰۴	۱۴	موضع گبجوائی	موضع گبھوائی
"	۱۵	سڑک قصبہ	سڑک پر قصبہ
۱۰۶	۴	حضرات	حضرت
۱۰۷	۵	بشن پال	یشن پال
۱۰۷	۱۷	مرات مسعود	مرآت مسعودی
۱۰۸	۱۳	ہرمنی بختیار	رہی بختیار
۱۰۹	۲۰	کاہیر	کاہلیر
۱۱۰	۶	احمد تگین	احمد نیال تگین
۱۱۱	۲۱	بیانات سے اور	بیانات اور
۱۱۲	۱۰	بابا ستوا	یا ستوا
۱۱۸	۴	جن میں	جس میں
۱۱۸	۲۱	ہپردا	پردا
۱۳۰	۱۰	ے بل آف	مے بل ڈف
۱۳۱	۲۰	سنگنا پراسی	سنگھا پراسی
۱۳۵	۶	جھنوں کا	جنکا
۱۳۵	۹	بہرائچ تحصیل	تحصیل
۱۴۰	۳	ببیوں	بیسوں
۱۴۸	۱۸	ایک وایت	ایک روایت
۱۵۰	۳	مغل دروازہ	نعل دروازہ





